ناول
بابو
آغا گل

بابو

ناول

آغا گل

مہردر

کتاب	بابو
مصنف	آغا گل
موضوع	ناول
پہلی اشاعت	2004ء
چوتھی اشاعت	2020ء
قیمت	300روپے

زیر اہتمام:

مہر در
انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، کوئٹہ
mehirdar@gmail.com
081-245350 5
0333-7832323

علم و ادب
پبلشر اینڈ بک سیلر
بک مال، تھرڈ فلور، دکان نمبر 311
اردو بازار، کراچی
رابطہ-0335-262064:

ڈسٹری بیوٹرز:
سیلز اینڈ سروسز
کبیر بلڈنگ۔ جناح روڈ کوئٹہ
فون :92-81-2843229
فیکس :92-81-2837672

اسٹاکسٹ:
یونیورسٹی بک پوائنٹ
شاپ نمبر 10، کمپلیکس
بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ
فون:0345 8813838

اپنے بھتیجے

آغا مہر گل

کے نام

اظہارِ حق ہے آج بڑا سخت مرحلہ
ہے حوصلہ تو آؤ میرے ساتھ دار تک

مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ 'بابُو' کا چوتھا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ یہ ایم فل اور ڈاکٹریٹ کے مقالوں کا حصہ بنا۔ میرے فکشن پر وطن عزیز کی بارہ یونیورسٹیوں میں ایم فل ہو چکے ہیں۔

میرے فکشن کو سمجھنے کے لیے بلوچستان کے گلی کوچوں کی زبان سے شناسائی ازحد ضروری ہے۔ قبل ازیں میر نے کہا تھا کہ دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیاں اس کے کلام کو سمجھنے کے لیے ازبسکہ ضروری ہیں۔ کوئٹہ میں بھی سات قومی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جس پر اہلِ کوئٹہ کو بجا طور پر ناز ہے۔ غیر معروف زبانوں کا تو ذکر ہی کیا۔ دہلی میں بھی سات قسم کی اردو بولی جاتی تھی، جبکہ کوئٹہ کی اردو سات قومی زبانوں کو اپنے اندر سمو چکی ہے۔ یہ سلسلہ چند سالوں نہیں بلکہ ہمایوں اور اکبر بادشاہ کے دور سے جاری ہے۔ اردو کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر زمین کی خوشبو اپنے بدن میں شامل کر لیتی ہے، ہر لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔ کوئٹہ کا اپنا دبستان اردو ہے۔ جسے تسلیم نہیں کیا جاتا۔

1839ء سے بلوچستان کالونی میں منقلب ہو گیا، جہاں غلام بستے ہیں، جسے ایجنٹوں کے ذریعے چلایا جا رہا ہے۔ انگریزوں کے ایک وزیر اعظم ظریف خان کی تعلیم پرائمری تھی۔ پرائمری پاس ظریف بلوچستان کو گدھا گاڑی کی طرح چلاتا رہا۔ یہی سبب ہے کہ ادب دوست، ادیب نواز معاشرہ موجودہ صورت اختیار کر گیا۔ معاشرہ ارتقائی مراحل سے نہ گزر پایا۔ حالات کے جبر نے معاشرتی کردار اور روایات بدل دیں۔ کچھ مخصوص طبقات کا ایجنڈا لے کر چلنے والے ہی چھائے

رہے۔ بلوچستان میں پرنٹنگ پریس 1880ء سے لگا۔ اس پہ بھی پابندی تھی کہ صرف سرکار کے لیے کام کرے۔ اسلامی دنیا میں مولوی نے چھپائی پر پابندی لگا کر سزائے موت تجویز کی۔ یہ پابندی 1817ء میں 362 برس بعد ہٹی تو ہم زمانے سے ہزاروں برس پیچھے رہ چکے تھے۔

انگریزی، ولندیزی، ہسپانوی، یوکرائنی زبانوں کو کبھی کبھی Spoken Vernaculars سے زیادہ اہمیت نہ تھی۔ لاطینی اور سنسکرت کی محدود طبقے تک پابندی نے قومی سماجی پیداواری تعلقات ونظام سے الگ کر دیا۔ زبانوں پر جبریت تاریخ کا حصہ ہے۔ طبقات اپنے مفادات کے لیے زبانوں کو مفلوج، محکوم وحقیر بناتے ہیں۔ زبانوں کو وسعت پرنٹنگ پریس نے دی۔ پرنٹ کیپٹل ازم نے زبانوں کو استحکام دیا۔ طبقوں کی نسلی برتری دہلی ولکھنؤ کے بعد رام پور، حیدرآباد، کوئٹہ کو دبستان دینے سے منحرف ہے۔ کوئٹہ کی اردو وسعت اور دھرتی سے جڑی ہونے کے باعث لامحدود ذخیرہ الفاظ رکھتی ہے۔

ادب گلی کوچوں میں پروان چڑھتا ہے، عوام میں مقبولیت پاتا ہے۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد بلوچستان حکومت کو چاہیے کہ کوئٹہ کی اردو کو نصاب کا حصہ بنائے، سرکاری خط وکتابت میں استعمال کرے۔ انگریز بھی صدیوں لاطینی میں تخلیقات کرتے رہے۔ انگریزی گنوار زبان قرار دی جاتی تھی۔ روس کا شاہی خاندان گھر میں فرانسیسی بولتا۔ لہٰذا کوئٹہ کی اردو کے خلاف تعصب تاریخی طور پر کوئی اچنبھا نہیں۔ کم از کم بلوچستان کی یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو کوئٹہ کی اردو باقاعدہ پڑھائیں جو صدیوں کے عمل میں بنتی چلی آئی ہے۔

کوئٹہ کی اردو کو پہلی بار میں نے تحریری زبان بنایا۔ میں نے کلیکٹش، جارگن اور ریجنل ازم میں لکھا۔ یہ ایک ٹرینڈ سیٹر ناول ہے۔ بلوچستان کی یہ غیر ادبی تحریری زبان ہے۔ جسے میں نے ادبی طور پر متعارف کرایا۔ ایسی کاوشوں سے کسی بھی زبان میں وحدت آتی ہے۔ نئے الفاظ، تراکیب محاورے کا اضافہ کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے از حد ضروری ہوا کرتا ہے۔ زبان ہی سماج کا مظہر ہوا کرتی ہے۔

نئے ناول نگاروں وسیم شاہد، فارس مغل، شیر دل غیب نے بھی بابوؔ کا اتباع کیا۔

محبت کیا ہے؟ میں آج تک نہیں سمجھ پایا۔کبھی یہ روح کا سکون بن جاتی ہے، کبھی جسمانی تقاضا، کبھی محض ایک جبلت، کبھی فقط ایک سیڑھی۔ جسے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔محبت کی ہمیں ایڈکشن ہے مگر ہم سخت نفرت کرنے والے لوگ ہیں۔ہم اپنی محبتوں کو کہانیوں تک محدود کر دیتے ہیں۔عملی طور پر اختیار نہیں کرتے۔

کیوں کہ ہزاروں برس سے یہی حکمرانوں کا اندازِ حکمرانی ہے۔حاکم، پروہت اور سپہ سالار کی ازلی مثلث مضبوط بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ یہ مصلحت کسی بلیک ہول کے طرح سماج میں موجود رہتی ہے اور محبتوں کو نگلتی رہتی ہے کیونکہ محبت کا راج ہوا تو شیخ و برہمن کے جھگڑے مٹ جائیں گے۔لاٹھی گولی کی حکومت دم توڑ جائے گی۔ پھر لڑے بھڑے گا کون۔حاکم کو کون تسلیم کرے گا۔ ہر شخص اپنے من کے پریم نگر کا راجہ ہوگا، بابو ہوگا۔

آغا گل

گل باغ سمنگلی روڈ، کوئٹہ

31 مئی 2020ء

aaghagul10@gmail.com

0303-3850099

بابُو

کوئٹہ میں ہر روز، روزِ عید، ہر شب شبِ برات کا عالم تھا۔

اسٹیج ڈرامے، پھلوں کی پرندوں کی نمائشیں، چکوروں کی لڑائیاں، بیڑوں کے دنگل، بروری نالے میں چرخ، کتوں، ریچھوں کی لڑائیاں، پتنگ بازی، ٹیلو، بڑی، باڑی، لگن میٹی، اونچ پنیچ، رسی ٹاپنے کے مقابلے۔ سہ پہر میں سبھی تفریح دیکھنے نکل پڑتے۔ چھاؤنی کے درختوں کے نیچے مختلف ٹولیاں آبیٹھتیں۔ جو اپنے چکور بھی پنجرے میں ساتھ ہی لے آتے۔ شعر خوانی ہوتی۔ بیت بازی کے مقابلے عام تھے۔ گھروں میں والدین اپنے بچوں کے ساتھ بیت بازی کرتے۔ گرمیوں میں قوال چلے آتے۔ پتلیوں کے تماشے گھر گھر ہوتے۔ گڑوی والیاں سڑکوں پہ گڈوی بجا بجا کر انعام وصول کرتیں۔ فٹ بال کے میچ ہوتے۔ 109 کی ٹیم اور دیگر فوجی یونٹوں کی فٹ بال ٹیمیں باہم مقابلہ کرتیں۔ عظم فٹ بالر جمعہ خان فرائی ڈے، جسے انگریز دیوارِ چین کہا کرتے، جسے فٹ بالر کلکتہ محمڈن میں جھنڈے گاڑنے والے اسماعیل درانی جیسے گول کیپر نوجوان کھلاڑیوں کی رہنمائی کرتے۔ اتوار کے روز سائیکلوں موٹر سائیکلوں پہ برتن، دیگچے اٹھائے ہنہ اڑک کی راہ لیتے۔ جلدی نکلتے کہ اچھی جگہ قابو کرلیں۔ اکیلے آنے والوں کو بہ اصرار آوازیں دے کر بلواتے اور کھانے میں شریک کرتے۔

طلبا یونینز بھی مقابلے کراتیں، پہاڑ پہ چڑھنے اترنے کا مقابلہ۔لڈو، شطرنج کیرم بورڈ کے مقابلے۔ریستورانوں میں جنھیں ہوٹل کہا جاتا، بھارتی گیتوں کی گونج ہوتی۔ دو آنے کپ کی چائے پی کر گیت تازہ دم ہو جائے۔مولوی اور شاعر انھیں رومانی فضا سے نکلنے نہ دیتے۔حوروں کے تذکرے، جنت کی فضا، کوچہ یار کی زیارت، ریڑھیوں پہ پانچ روپے سیر چلغوزہ اور چار آنے سیر انگور ملتے۔ قندھاری انار اور یہ بڑے بڑے سیب ریڑھیوں پہ لدے رہتے۔جمعہ کے دن کانوں کے مزدور ٹرکوں میں بھر بھر کر چلے آتے۔ان سے رونق بڑھ جاتی۔سفید شلوار قمیض پہنے سر پہ قراقلی سجائے فوجی جوان، آواز یں لگا لگا کرمشن روڈ پہ چھاؤنی سے نمودار ہوتے،" بچ او گرائیں" یہ راستہ بناتے کھاتے پیتے،تفریح کر کے آوٹ پاس لیے گیریژن کی راہ لیتے۔شہری انھیں چائے پیش کرتے۔ بڑھ کر گلے لگاتے کہ وطن کے محافظ اور سرحدوں کے نگہبان ہیں۔ان کے دم قدم سے رونق ہے۔شہری بے فکر ہو کر سوتے ہیں۔

سینما ہاؤسز بھرے پڑے تھے۔محبت کی فلمیں چلتیں۔آہ! فلم کا ہیرو ٹی بی میں خون تھوکتا، اچانک ٹھیک ہو کر نرگس سے شادی کر لیتا۔اور جانی واکر پہ ایک نواب زادی مر مٹتی ہے۔راج کپور پھٹے ہوئے بوٹوں میں "میرا جوتا ہے جاپانی" گاتا پھرتا ہے۔۔۔۔ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں، قہقہے ہی قہقہے تھے۔

بار اور شراب خانے کھلے تھے۔ بازارِ حسن اندھیرے میں ڈوبا جاگتا رہتا۔غیر ملکی سیاح جنھیں ہپی کہا جاتا، بڑی تعداد میں چلے آتے۔سردیوں میں صندلی میں پاؤں رکھ کر سر شام جنوں بھوتوں کی باتیں ہونے لگتیں۔پہیلیاں بوجھی جاتیں۔چڑیلوں کی باتیں ہوتیں جو مردوں کو اٹھائے جاتی ہیں۔گورا قبرستان کے پاس رات گئے سر کٹا بھوت پھرتا جس کی گردن سے خون جاری رہتا۔شام میں کوئی بھی گھر پہ نہ ملتا۔ہوٹلوں میں بل ادا کرنا بڑی مردانگی تھی۔کاؤنٹر پہ بل دینے کے لیے اچھی خاصی کھینچا تانی ہوتی۔مینیجر مسکرا مسکرا کے یہ دوستانہ جھگڑے دیکھتے، محظوظ ہوتے، پھر زیادہ زور آور سے رقم وصول کر لیتے۔ویٹر عقب سے آواز لگاتا،"بارہ آنے"۔

خواتین واک کے لیے چھاؤنی کا رخ کرتیں جہاں درخت سایہ دار اور سڑکیں کشادہ

تھیں۔ یہاں شہری فوجی یونٹوں سے گزرتے ٹینکوں اور توپوں کو دیکھتے۔ چھاونی کی تین توپوں کے علاوہ یونٹوں کی توپوں پر بیٹھ کر تصویر بنوانا چاہتے تو فوجی مسکرا کر اجازت دے دیتے اور گرائیں گرائیں کرتے لنگر کی چائے بھی پیش کرتے۔ شہری اپنی دکانوں کے پتے بھی دے جاتے کہ اتوار کو ان کے ہاں ضرور آئیں۔

انارکلی، لیاقت بازار اور ہاشمی مارکیٹ میں چاہنے والے ملتے۔ نہایت صفائی سے محبت ناموں کے تبادلے ہوتے۔ کوئٹہ والے کبھی خالی نہیں بیٹھتے۔ رات کو سڑکوں پہ سونے والوں کی چار پائیاں اٹھا کر دور رکھ آتے یا منہ میں نسوار ڈال کر بھاگ نکلتے۔ ہر جانب خوشیاں تھیں، امن اور محبت تھی، خلوص تھا، پاکستانیت تھی۔

بابو کو انھوں نے خاص توجہ نہ دی۔ آباد کار، نان لوکل جو تھا۔

وہ خوش شکل، دبلا پتلا کم زور لڑکا تھا۔ بال وہ وحید مراد کے سٹائل میں بناتا اور حتیٰ المقدور کوشش کرتا کہ کسی طور وحید مراد دکھائی دے۔ اس کے والد سرکاری ملازم تھے۔ اُن پر من و سلویٰ اترتا، تبھی انھوں نے سرکاری کالونی کے مکان کو لات ماری اور پڑھے لکھے شائستہ علاقے میں مکان خرید لیا۔ حالاں کہ یہ سڑک گوریلوں کا گڑھ تھی۔

ان لڑکوں کا کام تھا؛ ہیرو بننے کی ناکام کوشش کرنا، نقل سے امتحان پاس کرنا، اساتذہ کو تنگ کرنا۔ عجب اتفاق، وہ سبھی وقت سے پہلے ہی جوان ہو گئے تھے۔ اس لیے کسی کے قابو میں نہ آتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ بنا عشق کیے زندگی یوں بے مقصد ہے جیسے داشتی کا گدھا۔ جو صرف بوجھ لیے پھرتا ہے، ورنہ تو اس کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ عشق کا زیادہ تصور یوں ابھرا کہ، اُن دنوں کوئٹہ کی واحد تفریح سینما بینی تھی۔ ساری فلمیں عشقیہ تھیں۔ سارا شہر عشقیہ گیتوں سے گونجتا رہتا۔ ''انداز''،''کالی گھٹا''، ''حیات''، ''انتظار''، ''ساقی''۔ سینماؤں میں فلمی کہانیوں کی چند صفحات پر مشتمل کتابیں بھی دستیاب تھیں، تا کہ کہانی یاد کرنے والوں کو سہولت رہے۔ بعض دل جلے امتحان میں بھی وہی کہانیاں لکھ آیا کرتے تھے۔

بابو کی تین بہنیں تھیں اور وہ خود فقط ایک ہی بیٹا تھا، اس لیے خاصا لاڈلا تھا۔ ماں باپ اس کا ہر حکم بجالاتے، بہنیں بھی بہت لاڈ پیار کرتیں۔ اس نئے علاقے میں وہ اپنی سائیکل اور عشق ساتھ لایا تھا۔ چوں کہ لڑکا غیر خطرناک تھا کسی نے بھی درخور اعتنا نہ جانا۔ محلے بھر کے تھڑوں پر بیٹھ کر فلمی کہانیاں سنانا، اسکول کی باتیں دہرانا، کلچر تھا۔ اسے لیے وہ بابو کے تھڑے پر بھی حسب سابق دو پہر میں بیٹھے گھنٹوں بتا دیتے۔ زور زور سے قہقہے لگاتے، ساتھ میں گالیوں کے سابقے لاحقے لگاتے رہتے۔ پس دیوار بابو کی والدہ دعائیں دیا کرتیں۔

تھڑے پر محفل جمانے والے ان لڑکوں کی البتہ نرالی تکریم تھی۔ کسی کی والدہ نے کبھی ایسا رویہ اختیار نہ کیا تھا۔ کبھی کبھار تو وہ درواز کھول کر ڈانٹ بھی دیا کرتیں۔ ''ہونجا پھرے، سونے بھی نہیں دیتے۔ گم ہو جاؤ اپنی ماں کا سر کھاؤ۔ یہ تھڑا ہی تڑوا داں گی، تم لوگوں سے تبھی جان چھوٹے گی۔'' ادھر بابو کی والدہ دل جمعی سے با آواز بلند داد دیا کرتی، کسی نامعلوم اجنبی زبان میں۔ بعض لڑکے کہتے، یہ دوزخ کی زبان ہے جو مائی نے پہلے ہی سے سیکھ لی ہے تاکہ سند رہے اور بے وقت ضرورت کام آئے۔

ایک روز اس نے کھڑکی کھولی، کچھ بلائیں لیں اور پانی کی بالٹی سروں پر انڈیل دی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ اس قدر سردی میں وہ برفاب جانے کہاں سے بالٹی میں بھر لائی تھی کہ جسم نیلے پڑ گئے۔ بوڑھا دکان دار گزرا تو بہت محظوظ ہوا۔ وہ جگت چچا تھا۔ کبھی اسے بڑے میاں کہا کرتے۔ بڑے میاں نے انکشاف کیا۔ ''میاں، یہ راجستھانی زبان میں روز تمھیں گالیاں دیا کرتی تھیں کہ کائیں کائیں کرتے ہو۔ تم اسے دعائیں سمجھتے رہے۔ آج پانی پھینکا ہے، کہتی ہے نمونیہ سے جامرو۔ یہ راجستھانی لوگ بہت سخت ہوا کرتے ہیں۔ تم یہ تھڑا چھوڑ دو۔ اس چمن میں تمھارا ٹھکانہ نہیں۔''

اگلے ہی روز لڑکوں نے بابو کو جا پکڑا۔ وہ بستہ اٹھائے تعمیر نو اسکول سے لوٹ رہا تھا۔ شکل بھی شریفانہ تھی اور حرکتیں بھی شریفانہ۔ لڑکوں نے اس کی شکایت کی۔ بابو نے بتایا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ''ماں زور آور لڑاکا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ بھائی میں تو خود اس کے ہاتھوں تنگ ہوں۔ بڑی خوں خوار ہے''۔

"تمھارا ماں ہے، اس کو سمجھاؤ۔" نذیر نے احتجاج کیا۔

بابو نے سب سے معذرت طلب کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ وہ اگر بلدیہ ہوٹل چلیں تو سبھی کو چائے پلوائے گا، سموسے بھی کھلوائے گا۔ بلدیہ ہوٹل کے سموسوں کا نام سن کر سبھی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ترنت جھگڑا چھوڑ دوست بن گئے۔ بابو نے بھی بستہ کسی لڑکے کے حوالے کیا اور ساتھ چل دیا۔

بلدیہ ہوٹل دوپہر میں خالی پڑا تھا۔ انھوں نے دو میزیں جوڑ کر درختوں کے نیچے محفل جمائی۔ بابو نے پرس کھول کر سبھی دوستوں کو ایک تصویر دکھائی۔ ایک لڑکی مسکرا رہی تھی۔ یہ تصویر کسی ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار میں بھی استعمال ہو سکتی تھی، کیوں کہ دانت نمایاں تھے، برابر تھے اور چمک رہے تھے۔

"یہ لڑکی تمھارا محبوبہ ہے؟" سبھی بہت خوش ہوئے۔ کیوں کہ ان کہ پاس نہ تو ایسا نوٹوں والا پرس تھا، نہ ایسی محبوبہ جو ایسے موتیوں جیسے دانت نمایاں کر کے مسکرائے۔ انھیں بابو کی قسمت پہ رشک آنے لگا۔

بابو قسمت کا دھنی تھا، اکلوتا بھی تھا اور لاڈلا بھی۔ ہیرو، ہیرو بھی لگتا تھا۔۔۔۔وحید مراد جیسا۔

"ہاں، دوستو، میں تباہ ہوں اور میری والدہ اس لڑکی کی سخت دشمن ہے۔"

"تم چرت مت مارو، ہم لوگ تمھارا ساتھ ہیں۔"

بابو کی ہمت بندھی۔ "میں اکیلا ہوں، ماں بھی تنگ کرتی ہے۔ ڈاک خانے کی کالونی والے بھی۔"

"وہ لوگ کیا بولتا ہے؟ ڈاک خانے کا دال میں انڈا دیوے۔"

"کہتے ہیں ڈاک خانے کی لڑکی ہے، ہمارا حق ہے۔ تم کیوں ملنے آتے ہو۔ جب بھی جاتا ہوں، ترپیاں لگانے لگتے ہیں۔"

"اچھا، وہ بھی آسرا مارتے ہیں۔ شوٹ شوٹ چلو۔ ان کے ساتھ مالوم کرتے ہیں۔"

بابو نے بل ادا کیا۔ کالونی قریب ہی تھی۔ کوچہ یار کی جانب چل پڑا۔ التزام یہ رکھا کہ سارے ساتھی ذرا فاصلے سے پیچھے چل رہے تھے۔

بابو نے اس کی چھت پر ایک دو کنکریاں پھینکیں تو وہ دروازے پر چلی آئی۔ اچھی خوش سکل لڑکی تھی۔ کچھ باتیں کیں، کچھ مسکراہٹیں دیں۔ پھر دروازہ بند کرلیا۔

بابو کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ساتھ ایک محبت نامہ بھی لے آیا تھا۔ اپنا پاؤ بھر کا محبت نامہ اس لڑکی کو دے آیا۔ جس کا نام اس نے شازیہ بتایا تھا۔ پوٹل کالونی کے لڑکوں نے بابو کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ کود کر بابو کے سامنے آگئے اور کٹ کٹ کر کے سات نکی چاقو کھول لیے۔

"آگے آؤ زدے، تم لوگوں کو ابھی ابھی اسی ٹائم کھڈہ غلام محمد میں لے جائیں گے۔ زدے، گھوڑا بابا غاز میں کلٹی کریں گے۔"

ڈاک خانے کے لڑکے اتنے چاقو دیکھ کر گھبرا سے گئے۔ زور کے آگے زاری۔ لڑکے منمنانے لگے۔ "یہ شازیہ کو چھیڑتا ہے، روز چھیڑنے آتا ہے۔"

ادھر سے ڈپٹ پڑی۔ "زدے شازیہ تمہارا باپ کا لڑکی ہے۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ زیادہ غٹ غٹ مت مارو۔"

لڑکے گھبرا کر چلتے بنے۔ وہ ایسے خطرناک بدمعاشوں سے سہم گئے تھے جو بات بات پہ چاقو نکال لیا کرتے تھے۔

وہ دوبارہ ہوٹل میں آن بیٹھے۔

بابو کھلا جا رہا تھا۔ بابو نے سگریٹ منگوائے، چائے اور سموسے منگوائے، سارے دوست بہت خوش ہوئے کہ اتنا بڑا حاتم طائی ان کے علاقے میں آگیا۔ اب زندگی اچھی گزرے گی۔

بابو کو بھی خوشی تھی کہ اسے لڑنے بھڑنے والے دوست مل گئے ہیں، جو نیفوں میں کلپ اور سات نکی چاقو چھپائے پھرتے ہیں۔ بابو اب اکیلا نہ تھا۔ بابو گھل مل گیا کہ چند ہی دنوں میں گروپ کا حصہ بن گیا۔ کسی کو محسوس نہ ہوتا تھا کہ نیا ہے، اجنبی ہے۔

انور بابو سے جلتا۔ وہ اسے ایک آنکھ نہ بھاتا۔ بابو وحید مراد کی طرح بال بناتا، خوب بنا ٹھنا رہتا۔ جب دیکھو نئے کپڑے، نت نئے فیشن۔ اس کی وجہ سے انور کی اہمیت کم ہو رہی تھی۔ وہ اتھلیٹک کرتے، باکسنگ کرتے، پہاڑوں پہ دوڑتے، ٹیبلو کھیلتے، جب کہ بابو کسی ہوٹل میں سگریٹ سلگا کر محبت

بھرے گیت سنا کرتا، ڈائجسٹ خریدتا اور اس میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر رومانی فقرے نکالتا۔ پابک دستی سے ان فقروں کو تحریر کی لڑی میں پرو کر ایک عاشقانہ خط لکھتا۔ اس کا یہ عاشقانہ خط اردو کے پرچے کے برابر ہوا کرتا۔ ڈاک خانے کے لیٹر رائٹر کی طرح تیزی اور مشاقی سے خط لکھے چلا جاتا ہے۔

دن میں ایک بار وہ شازیہ سے ملنے ڈاک خانے کا کالونی جایا کرتا۔ ایک دو بار ڈاک خانے کے لڑکوں سے بابو کے ساتھیوں کی تجڑ بھیڑ ہوئیں تو بابو کی سپاہ سے پسپا ہو گئے۔ بابو کو اجازت دے دی گئی کہ وہ محبوب کے در پر آ کر کنکریاں پھینک سکتا ہے۔ کنکریاں تو کیا چاہے بم پھینک دے۔ خوف زدہ لڑکوں نے دعوت دی کہ اس سے گفتگو کر سکتا ہے۔ خطوط کا تبادلہ بھی کر سکتا ہے۔

سہ پہر میں وہ شفو استاد سے باکسنگ سیکھا کرتے۔ شفو ان سے چند ہی برس بڑا تھا مگر اس کا اصرار تھا کہ اسے استاد ضرور کہا جائے۔ استاد کا لفظ بدمعاشوں کی دنیا میں دادا کے برابر تھا اور شہر میں رائج تھا۔ اسکول میں جہاں کہیں بھی جھگڑا ہوتا وہ استاد شفو کو بلوالیا کرتے۔ اکثر و بیشتر تو اس کی بڑکوں سے ہی معاملہ سنور جایا کرتا۔ بات بڑھتی تو وہ ان کے دشمنوں کو گھونسوں پر رکھ لیتا۔

ایک استاد اور تھا؛ استا گھوڑا۔ وہ بابو کا بہت ہی گہرا دوست تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ دنیا کا ہر علم جانتا ہے۔ دنیا کے ہر موضوع پر علم کے دریا بہانے لگتا ہے۔ کوئی روکتا، ٹوکتا، اعتراض کرتا تو ایک تباہ کن گالی سے نواز کر آگے بڑھ جاتا۔

"پاکستان ایٹمی طاقت بنا تو کیا ہوگا؟" کسی نے سوال کیا۔ استاد اشرف چہک کر گوہر افشانی کرنے لگا۔ "دنیا میں اس ملک کی عزت ہے، جس کی کرنسی مضبوط ہے، جس کے پاس یورینیم ہو۔ امریکا کے پاس ایک ٹن یورینیم ہے۔ پاکستان کے پاس دس گرام ہے، جب ایک کلو بھی ہوا تو ایک پاکستانی روپیہ پانچ امریکی ڈالروں کے برابر ہوگا۔"

"استاد، اتنا علم کہاں سے سیکھتے ہو؟" متعجب سامع نے پوچھا۔

استاد اشرف نے انگلی آسمان کی جانب انکساری سے اٹھا دی جیسے کہہ رہا ہو علم خداداد ہے، من جانب اللہ ہے، علم لدنی ہے۔

استاد اشرف ہر ناممکن کام کو ممکن کر کے دکھاتا۔ بڑی میٹھی زبان بولتا، شلوار قمیض کے علاوہ

اور کوئی لباس نہ پہنتا۔ تمام پرچے بھرپور نقل کر کے حل کیے مگر پھر بھی تھرڈ ڈویژن میں دسویں جماعت پاس کی۔ اس کے بعد وہ ریلوے اسٹور کے سمندر میں کلرک لگ گیا۔ اس کے لگنے سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ وہ اسٹور میں چوری چکاری کرتا، روپیہ بناتا، دوسرا یہ کہ دوستوں کو آخری آرام گاہ مل گئی، جہاں کھانے پینے کو بھی ملتا۔ جب ان کا جی چاہتا، اس کے اسٹور میں چلے آتے۔ فوراً استاد انجن کے کروڈ آئل سے سوتر بھگوا کر آتش دان میں آگ سلگاتا۔ پائے بناتا۔ ٹمبولا کے لیے بھی پچاس فیصد کمیشن پر پیسے ادھار دے دیا کرتا یعنی اگر انعام نکلا تو وہ آدھا انعام استاد کو قابلِ واپسی ہوگا۔ یہ اپنی رقم کا بھی حق دار ہوگا۔ انعام نہ نکلا تو ادھار بہر حال قابلِ واپسی ہوگا۔ یہ بھی لازم تھا کہ جب بھی وہ مقروض کی رقم مانگنے کے لیے بہ نفس نفیس تشریف لائے، استاد اشرف کو اسے فل پروٹوکول دینا پڑے گا۔ چائے کے علاوہ سگریٹ بھی پیش کیے جائیں گے۔ آئی ایم ایف کی طرح ٹیڑھی شرائط پہ قرضہ دیا کرتا۔ تھرڈ کلاس کے ریلوے پاس حاصل کر کے دوستوں کو کراچی اور لاہور کی سیر بھی کرواتا۔

ایک ایسی ہی یاترا میں اسے گھوڑے کا خطاب ملا۔

ہوا یوں کہ ٹرین پنجاب کے کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر فجر کے وقت کراسنگ کے لیے کھڑی تھی۔ دوستوں نے ہڑبڑا کر اشرف کو جگایا جو اوپر کی سیٹ پر بے خبر سو رہا تھا۔ "استاد، استاد اٹھو دیکھو وہ کون سا جانور ہے۔ استاد جلدی کرو۔" اشرف چوں کہ عقلِ کُل تھا اور چاہتا تھا کہ سب کچھ اسی سے پوچھا جائے۔ تمام دوست اس کے علم کی گہرائیوں سے استعفادہ کریں۔ لہٰذا وہ کودا، جست بھر کے دروازے کی جانب لپکا۔ دیکھا تو پنجاب کی کہر آلو فضا میں پلیٹ فارم کے باہر ایک گدھا کھڑا ہے۔ نہایت ہی بدمزہ ہوا۔ مگر چہرے پہ شکن نہ آئی۔ اسی خوش دلی سے انکشاف کیا۔ "اسے دریائی گھوڑا کہتے ہیں، سبزی خور ہے، ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، زیادہ ٹوپ مت کرو، یہ مردار خور نہیں ہے جو تم کو کھا جاوے۔"

اس روز سے اشرف کا نام استاد اشرف دریائی گھوڑا زبان زدِ عام ہوا۔ کثرتِ استعمال سے استاد گھوڑا اور ازاں بعد صرف گھوڑا رہ گیا۔ شہر میں تین ہی گھوڑے مشہور تھے؛ مہربان ٹانگے والے کا گھوڑا جو جہاز کے بادبان کی طرح پتلا تھا۔ دوسرا خیر محمد ولد فیض محمد گریجویٹ گھوڑے دے

منہ والا۔ تیسرا ''اصلی تے وڈا'' بلکہ نوازائیدہ گھوڑا، استاد اشرف گھوڑا۔ یہ بھی طے پایا کہ جب تک گھوڑے کی شادی نہیں ہوگی، اولاد نہیں ہوگی، سکریبل میں Colt قابل قبول نہیں ہوگا۔ کیوں کہ گھوڑے کا بچہ ہی نہیں تو Colt کا وجود کیسے ممکن ہے۔ کچھ نئے دوست یہ لفظ بناتے تو فوراً بورڈ سے لفظ ہی نا قابل قبول قرار دے کر اٹھوا دیا جاتا۔ ''خر بوتل، Colt کیسا آ گیا۔ گھوڑے کا تو بچہ ہے ہی نہیں۔ اٹھاؤ اس لفظ کو۔'' چھ یا بارہ نمبر مفت میں مارے جاتے۔

دوستوں کا خیال تھا کہ استاد گھوڑے کے لیے اخبار میں ''ضرورتِ رشتہ'' کا اشتہار دے ڈالیں یا کسی Mare کے پاس رشتہ گھوڑے کے لیے لے جائیں۔

بابو کا شازیہ سے تباہ کن عشق چلا۔

اسی دوران چار پانچ من کاغذ کی ردی خطوط کی شکل میں شازیہ کے ہاں اکٹھی ہوگئی۔ کیوں کہ بابو کو بڑے بڑے خط لکھنے کا فطرتی شوق تھا۔ گھنٹوں خشوع وخصوع سے محبت نامے لکھتا رہتا مگر خود دل جمعی سے ہر ایک امتحان میں نمایاں طور پر اعزاز کے ساتھ بار بار فیل ہوتا چلا گیا۔ اتنے میں شازیہ کے والد کی تبدیلی ہوگئی۔ شازیہ سکھر چلی گئی۔ بابو اپنے لشکر کے ہمراہ اسے رخصت کرنے نکلا۔ ٹرین چلی، ریلوے میل سروس کے سارٹر بابو فرید کے توسط سے ڈاک کے ڈبے میں انھیں پناہ ملی۔ جب کہ بابو شازیہ کے ہمراہ سپیز نڈ تک سفر کرتا رہا۔

شازیہ کا گھرانہ چاہتا تھا کہ شازیہ کی شادی بابو سے کردی جائے مگر بابو کی والدہ کسی راجستانی لڑکی کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ ایسی لڑکی جو اُن کی اپنی ہو۔ شازیہ کی والدہ نے عندیہ بھی دیا کہ بابو پڑھ لکھ کر افسر بن جائے تو شازیہ کو بابو سے بیاہ دیں گے۔ بابو پڑھتا نہیں تھا، فقط محبت نامے لکھتا تھا۔

شازیہ کی ٹرین کو بابو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتا رہا، ہاتھ ہلاتا رہا۔ سواری کوئی تھی نہیں۔ سارے دوست سڑک پر نکل آئے۔ ایک رحم دل ٹرک ڈرائیور نے کوئلے کے ٹرک کے پچھلے حصے

میں بٹھالیا۔شہر پہنچے تو کوئلے کی سیاہ گرد سے پہچانے نہیں جارہے تھے۔

بابو نے ہوٹل والے کو تاکید کی کہ صرف درد بھرے گیت ہی لگائے جائیں۔ان درد بھرے گیتوں میں اور ناکام محبت کی کسک تھی۔بابو سگریٹ اور چائے سے درد دل کا مداوا کر رہا تھا۔دوستوں نے بھی ساتھ نبھانے کی خاطر اتنے سگریٹ پھونکے کہ اگلے روز سب کے گلے خراب ہو گئے۔قوالوں کے انداز میں بولتے رہے۔

شازیہ کے جانے کے بعد بابو کی زندگی میں ایک انقلاب یہ آیا کہ کھویا کھویا سارہنے لگا۔کہاں وہ ٹرن آؤٹ،کہاں یہ کہ شیو بڑھائے، ملگجے لباس میں گھومتا پھرتا۔بعض کہتے بابو کو دل پر چوٹ لگی ہے۔اس کی والدہ بہت پریشان ہوگئیں، بابو کا حلیہ دیکھ کر۔مگر ان کا دل نہ پسیجا۔فرمایا:

''کچھ بھی ہو تمھاری شادی کسی راجھستانی لڑکی سے ہی ہوگی۔آخر اکلوتے بیٹے ہو ہمارے۔'' خالو نے بھی نئی نئی فلم ''مغل اعظم'' دیکھی تھی۔اکبر بادشاہ کی طرح خالو بھی اَن پڑھ تھے۔انھیں صرف ٹیلی فون لائن کے رموز از بر تھے۔انھوں نے اکبر بادشاہ کے طرح بابو کی پیٹھ ٹھونکی ''تم ہمارے ولی عہد سلطنت ہو۔۔۔مال لگاتے ہیں تم پر آخر کس دن کے لیے! جو کچھ ہم چاہتے ہیں،تم وہی کرو گے۔''

بابو چوں کہ ایف اے میں اعلیٰ نمبروں سے فیل ہوا تھا اور شازیہ کے غم میں مبتلا تھا۔اس کے والد نے جسے سبھی خالو بروزنِ آلو کہا کرتے،اور یہ نام بھی خالو نے خود اپنے لیے تجویز فرمایا تھا۔فخر سے دوستوں کو یہ روح فرسا خبر سنائی کہ بابو کو اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور بھجوایا جارہا ہے۔بہ طور اتالیق اشرف گھوڑا ساتھ جائے گا۔داخلے کا انتظام بھی گھوڑے نے اپنے اثر ورسوخ سے کروایا تھا۔دوستوں کو یہ غم کھائے جارہا تھا کہ شاہ خرچ بابو ہاتھ سے نکل گیا اور سموسے بھی تو کیا بنے گا۔ایسا شاہ خرچ صدیوں میں پیدا ہوتا ہے و،رنہ تو سبھی کنگلے ہیں،جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں،غصہ پیتے ہیں اور تو بلوچستان میں کچھ ملتا نہیں۔دوبارہ ان ہی اشیائے خورد پر لوٹ آنا پڑے گا۔ہاں یہ ڈھارس بندھی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے گا تو ٹھاٹھ کرائے گا۔

عام خیال تھا کہ بابو کے جانے سے شہر میں کاغذ کی کمی دور ہو جائے گی۔ردی البتہ مہنگی ہو جائے گی۔شازیہ نے یہ دمِ رخصت کہا تھا کہ میرے پیچھے نہ آنا،میں مشرقی لڑکی ہوں۔شازیہ کو بھی

تھوڑی دیر ہی پہلے پتہ چلا تھا کہ وہ مشرقی لڑکی ہے۔ حالانکہ بڑا ڈاک خانہ کوئٹہ کے شمال میں ہے اور وہ قطعاً ہی ڈاک خانے کی لڑکی تھی۔ مشرق تو تنگ ہی کرتا ہے۔ سورج بھی مشرق ہی سے نکلتا ہے۔ نہ نکلے تو لوگ آرام سے سوئے رہیں۔ کالج بھاگنے کی ضرورت بھی نہ ہو۔ علامہ مشرقی نے بھی بڑے خاکسار مروا ڈالے۔ خود مزے سے جیل کی اے کلاس میں مرغ مسلم اُڑاتے رہے اور شاعر مشرق جس کی شاعری کالونیل غلامی کو تقویت دیتی ہے، انٹ شنٹ سی۔ جانے کس بقراط نے فیصلہ کیا تھا کہ کالج صبح لگنا چاہیے۔ حالاں کہ شریفانہ وقت بارہ بجے کے بعد کا ہے، مگر سچ کہا کسی نے کہ شرافت کا زمانہ نہیں

''بابو! تم جو گیا تو امارا لوگ کا کیا بنے گا''

''بھائی میں آتا جاتا رہوں گا''۔

''تم شازیہ کو ملے گا، راستے میں سکھر ہے۔''

''کیا کروں مجھے منع کر دیا اس نے کہ کبھی نہ ملنا، ہائے میری مجبور جوانی! وعدہ کر بیٹھا۔ اب وعدے کو نہ نبھانا بھی تو بداخلاقی ہے۔''

''بوتل! گم کرو وعدہ۔ ایسے وعدوں کا کیا؟ محبت آخر محبت ہی تو ہے۔''

''نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ بابو نے نیا سگریٹ سلگایا۔'' اب میں اپنا مستقبل بناؤں گا۔ تم ایسے مفت خوروں سے بھی جان چھوٹ جائے گا۔ ظالموں اتنے برسوں میں زہر تک نہ پلایا۔۔۔ خرتاوانی۔''

سبھی نے بوجھل دل سے بابو کو گھوڑے کی راہ نمائی میں رخصت کیا۔ گدھا محبت میں دولتی مارتا ہے جب کہ گھوڑا محبت میں گالیاں دیا کرتا ہے۔ ٹرین کی رخصتی سے پہلے وہ دوستوں کو گالیوں سے نوازتا رہا۔ یوں کھینچ کھینچ کو سوٹے مارتا، ان میں گالیاں اور سگریٹ کا دھواں پروتا رہا۔

گھوڑا تو بنیادی طور پر صرف بابو کا دوست تھا۔ باقی دوستوں کو اس کا غم نہیں تھا۔ گھوڑے کو مجرے سننے کا شوق تھا۔ جب کہ ساتھی ایسی جگہ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے بلکہ انھیں دلی خوشی ہوتی کہ اگر وہ کسی طوائف کے آستانے پر جان دے دیتا۔ وہ بچہ خوش تھا۔ اس لیے مجرا سن کر سوٹے

لگاتا، لوٹ آتا تھا۔ تھانہ روڈ کی گلیاں اس کی آخری آرام گاہ تھیں۔ جب فلاش میں لمبا ہاتھ مارتا تو اپنے جیسے دوستوں کے ساتھ جناح روڈ کے کسی اچھے سے ریسٹورانٹ میں چائے پیتا۔ پھر بوتل مارتا، خوب پی پلا کر وہ مجرا دیکھنے چلا جاتا۔ اس کے حسنِ اخلاق کے باعث اور کچھ یوں کہ وہ بچہ خوش تھا اس لیے عورت سے کچھ مزید طلب نہ کرتا۔ متعدد طوائفوں سے اس کے برادرنہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ اب ان طوائفوں سے ہیرا منڈی کے References لے کر جا رہا تھا۔

سبھی کو بابو سے بچھڑنے کا ملال تھا۔ وہ ان داتا جو تھا۔

"بابو، شوٹ جاؤ شوٹ آؤ۔ یار جلدی جلدی تعلیم کرو، چھٹیاں تو ہوئے گا۔"

"بس یار کیا کروں۔" بابو کراہا "ابا کی ضد ہے ورنہ تو ایسٹ آر ویسٹ کوئٹہ از دی بیسٹ۔"

"بابو تم چرت مت مارو۔ چار مہینے بعد تو لاہور کے کالج بند ہو جائیں گے۔ شوٹ آ جانا۔ گھوڑا ریلوے کا پاس لے دے گا۔ بابو تم نے ہم لوگوں کو گیر کیا ہے۔"

"میں بھی تم لوگوں کے لیے سخت ٹکر ٹکر ہوں۔" بابو نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

ٹرین رخصت ہوئی تو ساتھی اسے کول پور تک چھوڑنے گئے۔ واپسی پر لفٹ مانگتے، رات گئے پہنچے۔

دو ایک روز تو بابو کے لیے اُداس رہے مگر پھر بھول بھال گئے۔ وہ سب چائے پی، درد بھرے گانے سن کر نشاط ہوٹل سے لوٹ رہے تھے کہ محلے میں بابو کا ہم شکل دکھائی دیا۔ توجہ زمیبا نے دلائی۔ اس کا نام تو ضمیر الحسن صدیقی تھا، اتنا مشکل نام زبان پر نہ چڑھتا، بچپن ہی سے سبھی زمیبا پکارنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ بھی اپنا اصل نام بھول گیا۔

"دیکھو بابو کا ہم شکل، اڑے بالکل بابو کا مافق ہے، زوے؛ بابو کا روح تو نہیں ہے۔"

یوسف حیران رہ گیا "ہو بہو بابو کا شکل ہے۔ خالو ہم کو شروع سے چکر باز لگتا تھا۔ کوئی شکار پوری چکر ہے۔ خالو کا کوئی لڑکا راجھستان سے تو نہیں آ گیا۔ ہو سکتا ہے خالو نے کوئی خفیہ شادی کر رکھی ہو۔"

اتنے میں بابو کے ہمزاد نے للکارا "زمیبا، یوسف، انور، نذیر۔۔۔۔" وہ سب کو نام لے لے

کر پکارنے لگا۔ ایک جست بھری اور دوڑ کر معانقہ کرنے لگا۔ وہ بچ مچ کا بابو تھا۔ انھوں نے مناسب جگہوں سے ٹٹول کر تصدیق کی کہ واقعی بابو ہے۔ جو پری میچور پائلٹ کی طرح وقت سے پہلے ہی اس جہانِ فانی میں لوٹ آیا تھا۔

"سب تم کو کٹ کٹ دیکھ رہے تھے۔ اتنا جلدی کیسے آ گیا۔ یہ کیا چکر ہے۔ تمھارا تعلیم کا کیا ہوئے گا؟"

"اڑے بتاتا ہوں، دم تو لو، چلو بلدیہ ہوٹل۔"

ذہنوں میں سوال گردش کر رہا تھا؛ گھوڑا فوت گیا کیا؟ ہیرا منڈی میں بلا کولٹ پیدا کیسے۔ دو ہفتے بعد بلدیہ ہوٹل کی پرکیف فضا میں قدم رکھا۔ اعراف سے جنت میں آ مجر اشتے اور وہاں دو ہفتے بعد سب نے سموسے کھائے۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔ "ایسی کیا زندگی جس میں سموسے نہ ہوں۔"

بابو نے بپتا سنائی کہ گھوڑے نے اسے کالج میں داخل کرا دیا مگر ہاسٹل پسند نہ آیا تو ہوٹل میں گھوڑے کے ساتھ رہنے لگا۔ شام کو ہیرا منڈی چلے جایا کرتے۔ طوائفیں گھوڑے کو ریفرینسز کی وجہ سے بڑی وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا کرتیں۔ خصوصی توجہ ملتی۔ طوائفیں تو گھوڑے کو ہاتھوں ہاتھ لیا کرتیں۔ رات گئے مجرے سن کر، پی پلا کر وہ لوٹ آیا کرتے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ صبح کالج جانا مشکل ہوتا۔ بابو بارہ ایک بجے کالج پہنچتا تو علم ہوتا کہ سارے پیریڈ لیے جا چکے ہیں۔ ایک روز سینئر لیکچرر نے یوں نصیحت کی۔ "برخوردار! واپس گھر چلے آؤ۔ کیوں پردیس میں زندگی ضائع کر رہے ہو۔ یہ زندگی، تم کوئٹہ میں بھی تو بخوبی ضائع کر سکتے ہو۔"

بابو کے پرس میں کسی لیکچرر نے شازیہ کی تصویر دیکھ کر یہ تبصرہ کیا تھا۔

always keep a picture of your girl friend

in your wallet. Look, while in trouble. You will

feel hat other problems arw not as big as this

one.

گھوڑے نے دیکھا کہ چار مہینے کے اخراجات جو خالو نے ادا کیے تھے، وہ ہفتہ بھر میں

ختم ہوئے جاتے تو اس نے باگیں موڑیں۔ بابو نے دیکھا کہ گھوڑا داغِ مفارقت دیے جا رہا ہے تو فوراً الم سے سوٹ کیس باندھ کر ساتھ چل پڑا۔ گھوڑے کے سبب ٹھاٹ سے سفر کیا۔ بلا ٹکٹ مگر پکڑے گئے بغیر ہی گھر پہنچ گئے۔ ماں نے جوراجھستانی زبان میں گالیاں اور کوسنے دیا کرتی تھی، بابو پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ بھی سوٹ کیس پٹخ کر دوستوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ خالو ریٹائرمنٹ کے بعد بجھا بجھا سا رہتا۔ اس کی انا بھی Dormant رہتی مگر جب کبھی بھڑکتا تو طوفان بن جاتا۔ تاہم خالو جب بھی غیرتِ قومی کا مظاہرہ کرتا، بابو فوراً خودکشی کی دھمکی دیتا۔ تینوں بہنیں "بھیا، بھیا" کہہ کر بلکنے لگتیں۔ گالیوں والی ماں بھی ماہی بے آب بن جاتی۔ لہٰذا خالو بھی مونچھ نیچی کر لیا کرتا۔ جس سے بابو شیر ہو جاتا۔

بابو کی زندگی کی کہانی دردناک بھی تھی اور سبق آموز بھی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ دن بھر بستر میں گاندھی کی طرح مرن برت میں رہے گا۔ ناتواں پسلیاں نکال کر اپنے کمرے میں لیٹا رہے گا۔ شام کو دوستوں سے ملنے آیا کرے گا۔ ہوٹل کا بل بڑھ گیا، کیوں کہ وہ چپکے چپکے کھایا کرتا۔ بل کے ساتھ ہی چند روز میں اس کی داڑھی بھی بڑھ گئی۔ وہ اُداس چہرہ لیے، آنکھوں پر مایوسیوں کا پردہ سجائے، نہایت دل شکن گٹ اپ بنائے، بستر میں لیٹا دل گداز گانے سنتا رہتا۔ خالو نے کچھ عرصہ مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ماں اور بہنوں نے بھی زنانہ وار مقابلہ کیا یعنی برداشت تو کرتیں مگر روتی بھی رہتیں۔ آخر خالو کی سٹی گم ہوگئی۔ اسے مطالبہ تسلیم کرتے ہی بن پڑی کہ بابو دوستوں کے ساتھ گورنمنٹ کالج سریاب میں ہی پڑھے گا۔ خالو کو ڈر تھا کہ کہیں بابو کی سرد سرد آہوں سے شہر میں وقت سے پہلے خزاں نہ آجائے۔ خالو نے شکست تسلیم کی اور مطالبات یکے بعد دیگرے مانتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ خالو نے گھٹنے ٹیک دیے۔ بابو کو کالج جانے کے لیے نئی ہنڈا ایسوننٹی موٹر سائیکل بھی دلوا دی۔

سبھی دوست بہت خوش ہوئے۔ ایک ساتھ اتنی خوشیاں بابو کو مل گئیں۔ ان کا بھی نان، نفقہ چلنے لگا۔ پہلی بار موٹر سائیکل ہاتھ لگی تھی۔ سبھی کود پڑے۔ ایک دوسرے کو پکڑ کر لٹک کر دوست اس ہنڈا پر سوار ہوئے اور ہنہ جھیل جا پہنچے۔ ہینڈل پر زمبیا بیٹھا۔ یوسف کا قد بہت چھوٹا تھا، اسے بچے کی طرح گود میں بٹھا لیا۔ یوسف کے پاؤں ہوا میں معلق تھے۔ بڑی تفریح رہی۔ سبھی دوست

اپنی قسمت پر ناز کرتے۔

ایک روز بابو گرلز کالج کے طواف کے لیے یوسف کے ہمراہ جا رہا تھا کہ ٹریفک پولیس نے روک کر ڈرائیونگ لائسنس طلب کیا۔ لائسنس تو تھا ہی نہیں۔ ایک بار اس نے موٹر سائیکل روکی۔ پھر اچانک دوڑا دی۔ سپاہی نے لپک کر پکڑنا چاہا تو یوسف ہاتھ میں آ گیا۔ بابو تو موٹر سائیکل سمیت نکل گیا، یوسف سپاہی کے ہاتھوں میں لٹک گیا۔ سپاہی نے گھبرا کے یوسف کو زمین پر کھڑا کیا۔ بابو رفو چکر ہو چکا تھا۔

''زو ئے ہم کو کیوں پکڑا ہے۔'' یوسف چلایا۔ راہ گیر اس کی پکار پر دوڑے چلے آئے۔ سوختہ دلان ان کو ٹنہ کو لوٹنے بھڑنے کا شوق رہتا تھا۔

''اس لڑکا کو کیوں پکڑا ہے۔''

سپاہی بوکھلا گیا۔'' یہ بغیر لائسنس کے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔''

''موٹر سائیکل کدھر ہے۔ خرگو دڑا۔'' وہاں موٹر سائیکل تو تھا نہیں۔ سبھی پولیس والے پر لعن طعن کرنے لگے۔'' خر بوتل! ازو ئے تم لڑکوں کو تنگ کرتا ہے، ناحق کرتا ہے۔ تمہارا دال میں انڈا دیوے۔ کدھر ہے موٹر سائیکل گیڑو۔''

ٹریفک پولیس نے گھبرا کر یوسف کو چھوڑ دیا۔

اُدھر بابو مزے میں یوسف سے باتیں کرتا، موٹر سائیکل چلا رہا تھا مگر یوسف صُمّ بُکمّ بیٹھا تھا۔ پلٹ کر جو دیکھا تو یوسف غائب۔

فوراً گھوڑے کے ہاں پہنچا۔ دونوں یوسف کی تلاش میں نکلے۔

اتنے میں یوسف خود ہی بکتا جھکتا چلا آیا۔'' خر بے وفا! زو ئے ہم کو پولیس کے پاس چھوڑ کر بھاگ گیا...... یا ما۔''

دوستوں نے بابو پر جرمانہ عائد کر دیا کہ آخر وہ بھاگا کیوں تھا۔ ادھر بابو کی موٹر سائیکل بھی دوست بلا تکلف استعمال کرنے لگے۔ بابو کی دیکھا دیکھی ہر ایک نے اپنے اپنے گھر میں ہنگامہ فساد شروع کر دیا۔ زمبیا کو بھی ااسکوٹر مل گیا اور انور کو بھی۔ اب حسیناؤں کے درشن کرنے کے لیے موبلیٹی

اور صلاحیت بڑھ گئی۔ مشن روڈ اسکول کی چھٹی کا وقت، ویمن کالج کی چھٹی کا وقت از بر تھا۔ اکثر دوستوں کی خواہش تھی کہ بعد از مرگ انھیں منان چوک پر دفن کیا جائے تا کہ آتی جاتی حسیناؤں کو دیکھتے رہیں اور مرنے کے بعد خدا کی قدرت اور صناعی کی تعریف کرتے رہیں۔ کمال ہے: مٹی سے کیسی کیسی سندر سندر صورتیں نکالتا ہے۔

بابو کا کامیاب اداکاری کے بعد ان کے کالج میں گویا داخلہ لے چکا تھا۔ خالو کی دولت وہ دونوں ہاتھوں سے اڑا رہا تھا۔ بابو پوتڑوں کا نواب تھا۔ خالو چاہتا تھا کہ کہیں افسر لگ جائے، خوب رشوت لے۔ بابو خوب ٹھاٹھ سے رہے، پڑھ لکھ کر بابو اعلیٰ کھائے، مال بنائے، عیش اڑائے، سرکاری افسروں کی طرح کھائے، مگر نہ شرمائے بلکہ غرائے۔ اس کے چچا یعنی اپنے پیارے بھائی کی راجھستانی بیٹی سے بابو کی شادی کر دی جائے۔ کیوں کہ اسی کے بیٹے سے ان کی اپنی بیٹی کی بات پکی ہو چکی تھی۔

لوفر گروپ کا سب سے محنتی ساتھی انور تھا۔ ادھر وہ کسرت اور رنگ میں شفو استاد سے پٹ پٹا کر، باکسنگ کھیل کر لوٹتا۔ ادھر بابو معہ لشکر دوستاں، اسے لینے آجایا کرتا۔ ان سب کو گیم سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ بس کھانے پینے، فلمیں دیکھنے اور عشق کرنے کا چسکا تھا۔ اس عشق میں جان جانے کا خطرہ بھی لگا رہتا۔ کیوں کہ لوگ دھڑے سے گولی مار دیا کرتے۔ ایک بار زمبیا اپنی محبوبہ سے عشق فرما رہا تھا کہ گھر والوں کو شک ہو گیا۔ محبوبہ کا باپ کہ تمار بندوق میں چھ نمبر کارتوس ڈال کر دوڑا۔ دھڑے سے گولی چلائی۔ زمبیا ننگے پاؤں باہر لپکا۔ والدِ محبوبہ کا خیال تھا کہ چور ہے۔ شکر ہے کہ اور کچھ نہ سمجھے۔ زمبیا دیال باغ میں جا چھپا۔ محلہ جاگ اٹھا اور تسلی تشفی بھی کرنے لگے کہ چور اندر کیسے جا گھسا۔ زمبیا نے موقع غنیمت جانا اور خود بھی سڑک پر کھڑے ہجوم میں آملا۔ اتنے میں اس کے ماموں کی نظر زمبیا کے ننگے پاؤں پر پڑی۔ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔ فرمایا "بیٹا بغیر جوتوں کے نہ نکلا کرو۔ جاؤ چور کو ہم پکڑ لیں گے۔ صبح تمھیں کالج بھی جانا ہے۔"

اگلی صبح جب کہ زمبیا سہانے سپنے دیکھ رہا تھا۔ کالیوں کے شور سے زمبیا جاگا تو ماموں نے خوب درگت بنائی اور اعلان کیا کہ یہ سب کچھ آوارہ گرد دوستوں کی صحبت میں رہنے کا اثر ہے۔ کل

کلاں کچھ ہوگیا تو خاندان کا کیا بنے گا۔ خصوصاً انھوں نے بابو کا بار بار نام لیا کہ خاندانی عاشق ہے، ڈنکے کی چوٹ پر عشق کرتا ہے۔ ماموں چوں کہ ڈاک خانے کے ملازم تھے، انھیں بابو کے طوفانی عشق کا خوب علم تھا۔

اس روز زمبیا کالج میں بابو پر برس پڑا۔ ''تمھارا لکر توڑ عشق نے ہم کو بھی بدنام کیا ہے۔ زوئے لوگ بچہ خوش ہیں، بچہ ڈب ہیں۔ چیر چھانٹی میں ہر آدمی عشق کرتا ہے۔ تمھارا جمعہ خانی سے ہم لوگ خوار وزار ہے۔ زوئے چھپ چھپ کر عشق کرو۔ ماموں بولتا ہے۔''

بابو نے فخر سے چھوٹا سینہ تانا۔

''تمھارا ماموں بزدل ہے۔ ڈاک خانے میں اس کا بکری گم ہوگیا ہے۔ چرتی ہے؛ اسے کیا معلوم عشق کیا ہے، میں خاندانی عاشق ہوں، چھوڑ دو مجھے ہمیشہ کے لیے۔''

''پھر ہم کو سموسے کون کھلائے گا۔'' زمبیا نے سوال کیا۔

''ہمارا ماموں بھی تمھارے خلاف ہوگیا ہے، گُرگُر کرتا ہے۔''

بابو کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

کالج کے سامنے بی بی نانی کا مزار تھا۔ جہاں سے وہ منت والے رومال چرایا کرتے تھے اور کھانے کی چیزیں بھی اٹھالیا کرتے۔ آخر وہ بی بی کے معتقد تھے۔ حسینائیں بھی بڑی عقیدت سے مزار کے جھنڈوں پہ رومال باندھ کے جایا کرتیں کہ ان کا روٹھا محبوب لوٹ آئے یا جس لغڑی کو وہ چاہتی ہیں، اس سے شادی ہو جائے۔ وہ تو سبھی یوسفِ ثانی تھے۔ اپنے علاوہ انھیں ہر شخص لغڑی دکھائی دیتا۔ حسد بھی ہوتا انھیں اور یہ غم کھائے جارہا تھا کہ کوئی بھی، کیسی بھی، کبھی بھی ان کے لیے منت کا رومال باندھنے نہیں آتی۔ وہ حسینوں کو حاصل کرنے کے لیے مختلف مزاروں پر ان کی منت کے لیے بلی مارکہ اگربتیاں جلاتے پھرتے۔ بزرگانِ تصوف سے ان کے خوش گوار تعلقات تھے۔

ایک بار چلتن بابا کے مزار پر رو رو کر دعائیں مانگ رہے تھے کہ اچانک انور کے سر سے بندھا رومال اڑ گیا۔ انور نے دعاؤں کا سلسلہ روک کر صاحبِ مزار سے معذرت چاہی۔ ''سوری، چلتن بابا۔'' اور پلٹ کر زمین پر پڑا رومال اٹھا کر عقیدت سے دوبارہ سر پر باندھ لیا۔ اس پر دوستوں کا

قہقہہ بلند ہوا۔ چند روحانیت کے جویا جو آنکھیں بند کیے مزار کا راشن کھا کے غنودگی میں پڑے تھے،
خفا ہوئے کہ مزاروں پر ہنسا منع ہے، پھر ایسے بلند قہقہے کیوں لگائے۔ گمان غالب تھا کہ ان کی نیند
میں خلل پڑا ہوگا۔ اتنے میں مجاور، ان کی مدد کے لیے بڑھا۔ "یہ چلتن بابا کے پیارے مرید ہیں۔
انھیں بابا سے لاڈ لگانے دو۔"

پورا گروہِ دوستاں اُس روز بھی بی بی نانی کے مزار سے چڑھاوے غائب کر کے کالج کی
کینٹین کے باہر تناول فرما رہا تھا کہ زمبیا جو ماموں گزیدہ تھا، بابو کا ستایا ہوا تھا، اس کی زبانی معلوم
ہوا کہ وہ سب بدنام لوگ ہیں۔ خصوصاً بابو۔ بابو نے دکھ بھرا کش لگایا۔

"میں شہزادہ سلیم ہوں۔ تمہارا ماموں مغل، اعظم ہے۔ اسے مغل اعظم فلم دکھاؤ۔ اس کے
سر پر ڈاک خانہ سوار ہے۔ وہ کیا جانے محبت کسے کہتے ہیں۔ گندرخ کیے ڈاک خانے میں پڑا رہتا
ہے۔ ماموں کیا جانے ادرک کا سواد۔ ظالم نے میرا زخم دل چھیل ڈالا۔"

ویسے بابو کبھی تبصروں کا برا نہ مانتا۔ جب گھوڑے نے انھیں بتایا کہ وہ ہیرا منڈی بابو کو
مجرا دکھانے لے گیا تو بابو کا پہلا تجربہ تھا۔ چاندنی بچھی دیکھ کر بابو ہچکچایا۔ بوٹ اتار کر چاندنی پر جا بیٹھا۔
سبھی کھلکھلا کر ہنس دیے۔ نائیکہ نے قہقہہ لگایا۔ "جمعہ کی نماز کے لیے آئے ہو کیا برخوردار؟"، ایک تماش
بین نے فقرہ کسا۔ بابو گلابی ہو گیا۔ صورت حال سے طوائف نے لطف اندوز ہو کر مجرا شروع کر دیا۔ بابو
پر زیادہ توجہ دیتی رہی۔ گانا ختم ہوا تو اس نے دروازے بند کروا کے صرف بابو کے لیے مجرا کیا اور
بابو کو مجبور کیا کہ وہ بھی رقص کرے۔ دونوں کچھ دیر مل کر ڈانس کرتے رہے۔ بابو تو ناچنے والی کے ساتھ
ساتھ اس کی کاپی کیے جا رہا تھا۔ کافی روپیہ اس بت طناز پر نچھاور کر کے اٹھا۔

اتنے میں ایک نئی رقاصہ آ گئی۔ گھوڑے کو دیکھ کر محبت سے پکارا۔ "ارے اشرف! تم
لاہور کب آئے۔" اتنی اپنائیت دیکھ کر بابو کو سخت غصہ آیا۔ "یہ کیا تمھاری خالہ ہے؟" بابو نے گھوڑے پر
وار کیا۔

طوائفیں چند ہی روز میں بابو کی ساری پونجی نگل گئیں۔ روپیہ ختم ہوا تو ایسے سخت فقرے
بولے، بے مروتی والے، کاروباری کہ بابو شرما کے رہ گیا۔ کاروباری کہ بابو شرما کے رہ گیا۔ اسے نہ گانا

پسند تھا، نہ ہی بجانا۔ اسے بس عشق چاہیے تھا۔ شاید وہ پچھلے جنم میں کسی سب پوسٹ آفس کا پوسٹ ماسٹر رہ چکا تھا، یا کسی ڈاک خانے کے باہر بیٹھا چٹھی نویس، جو دو روپے میں خط لکھ کر دیا کرتے ہیں۔ اسے محبوب سے اتنی محبت نہ تھی، جس قدر کہ لگن اسے خط لکھنے کی تھی۔ شاید اس میں کسی مرحوم چٹھی رساں کی روح تھی۔ جمعہ کے روز لیاقت بازار کے تھڑوں پر کتابوں کی سیل لگتی تو وہ ایسی کتابیں تلاش کیا کرتا؛ بیوی کے نام شوہر کے خط، محبوب کے نام خط، عشقیہ خطوط، مشہور عشقیہ خطوط، سنگ دل محبوب کا دل پگھلانے والے سنہری خطوط۔

اس عشق نے بابو کو در بہ در کر دیا تھا۔ وہ کسی محبوب کی تلاش میں رہتا۔ اقبال کے مرد شاہین یا کسی جرنیل کی طرح اِدھر اُدھر چونچ مارتا، نیا نشیمن تلاش کرتا پھرتا، آسرا مارتا رہتا۔ کبھی خود ہی بے کل ہو کر نعرہ مارتا۔ ''ہے مولا بھیج سونے کی توپ، چاندی کا گولا'' کبھی کسی ہوٹل میں آہیں بھرتا۔ کبھی دل گرفتہ شاعری فرماتا۔ ویمن کالج کے طواف کرتا۔ خالو کی دولت وہ بدستور دوستوں پہ لٹائے جا رہا تھا۔ اس کا مال کھا کے سبھی اس کے ہم نوا تھے۔ ہر دوست چاہتا کہ وہ بابو کہ زیادہ قریب رہے۔ بابو بڑا دیالو تھا۔ اس کا سب سے زیادہ مال گھوڑا کھا جایا کرتا تھا۔ پھر بھی بابو پر ہنہناتا رہتا اور کبھی کبھار دولتیاں جھاڑتا۔

ایک دو بار انور کو شبہ ہوا سا ہوا کہ میٹر ریڈر کی طرح بابو استاد شفو کے گھر کی سیڑھیوں پہ کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے۔ شفو سے بابو کی بات چیت نہ تھی۔ شفو کسرت کرنے والا باکسر تھا۔ اسے روتے بسورتے عاشق کبھی اچھے نہ لگتے۔ اس لیے وہ بابو کو بھی گھاس نہ ڈالتا۔ ایسے میں بابو کا شفو کے دروازے پر دیکھنے جانا، عجیب سے بات تھی۔

انھی دنوں ایک بار پھر بابو امتحان میں فیل ہو گیا۔ جب کہ زمبیا بھی پاس ہو گیا اور انور بھی امتیازی حیثیت سے اعلیٰ نمبروں کے ساتھ کامیاب رہا۔ گھوڑے سے مشورہ لینے ریلوے اسٹیشن کے اس حصے میں پہنچے جہاں گاڑی کو دھویا جاتا تھا۔ گھوڑا حسبِ معمول کندھوں پر چادر لپیٹے سوٹے لے رہا تھا۔ کچھ ملازم اس کی خدمت میں جتے ہوئے تھے۔ لوٹ کھسوٹ میں وہ ماتحتوں کو بھی حصہ بہ قدر جثہ دیا کرتا یعنی جو جتنا چاتر بڑبولا ہوتا، اسے زیادہ وہ حصہ دیا کرتا۔

بابو کے ناگہانی فیل ہونے کے باعث ان سب کا بابو کے لیے دل دکھی تھا۔ تھکے ماندے ریلوے کی خستہ حال کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ بابو نے بپتا سنائی اور مدد چاہی۔ گھوڑے نے ارشاد فرمایا: ''زوئے تم کیا پڑھے گا۔ گرلز کالج میں چوکی داری کرو، سارا دن لڑکیوں کو خط دیتے رہنا۔ سارا دن لڑکیوں کے اسکولوں، کالجوں کی بالکل مفت فی سبیل اللہ چوکی داری کرتے ہو۔ جو اچھی لگتی

ہے۔اس کے پیچھے پیچھے بڑبڑ چلتے ہو۔اسے کالج تک پہنچاتے ہو۔چھٹی کے وقت پر آ کھڑے ہوتے ہو۔دوبارہ گھر تک پہنچاتے ہو۔تمہارا کاروبار ہے۔خالو کو بولو ہم پاس ہوگیا ہے۔"

نذیر کو یہ برا لگا۔"یہ ڈھور ڈنگر گناہ گار کدھر صحیح ہوئے گا۔باپ کا مال ہے۔۔۔۔اڑاؤ۔خود کھاؤ، دوستوں کو کھلاؤ۔"

بابو بہت ہی دل برداشتہ ہوا۔"زدے چرچرمت کرو۔ابھی ہم کیا کرے۔ہمارا باپ ہم کو نہیں چھوڑے گا۔ہے بھی پورا راجھستانی۔ہمارا تختہ کردے گا۔"

زمبیا نے گھوڑے کی سوئی ہوئی غیرت جگائی۔"تم کو ہم استاد بولتے ہیں۔کوئی جگاڑ کرو۔بھو۔شوٹ شوٹ۔"

"استاد بابو مارا جائے گا۔اس کا خونِ حق تمہاری گردن پر ہوگا۔خواہ مخواہ تم اس کا تباہی میں شامل ہے۔استاد نے تم اس کو جوا کھایا،ڈرنک سکھائی،مجرے دکھائے ظالم۔"

گھوڑا بدک گیا۔"اس عاشق نامراد کو ہم کیا بولا۔خود خوار ہے۔بڑبڑ بارہ پتھر بار۔سارا دن عشق کرتا ہے۔رات کو اخبار کے برابر محبت نامے لکھتا ہے اور لڑکیوں پر خط پھینکتا ہے۔پوسٹ مین کا بچہ۔ہم کیا کرے؟"

زمبیا غصے سے اکھڑ گیا۔"استاد!اتم نے بابو کا تختہ کیا ہے۔خالو نے بولا تھا،لاہور لے جاؤ، کالج میں داخل کرو،ہاسٹل میں رکھو۔تم اس کو ہیرا منڈی میں خوار کیا۔اس کا سارا پیسہ چٹ کیا،ختم کرادیا۔ابھی تم جگاڑ کرے گا۔فالتو گرگرمت کرو۔"

استاد نے چند سوٹے لیے، انھیں گالیوں سے مزید نوازا، اور رزلٹ کارڈ لے کر فرمایا:"چائے پی کر گم ہو جاؤ۔چند دنوں میں کامیابی کا رزلٹ کارڈ مل جائے گا۔"

دو روز بعد گھوڑا خود ہی چلا آیا اور خوشی سے ہنہنانے لگا۔اس کے ہاتھ میں جعلی رزلٹ کارڈ تھا۔اس کے مطابق بابو اعلیٰ نمبروں سے پاس ہو چکا تھا۔یہ جعلی کارڈ اس نے چیتی بھائی یعنی شعبہ امتحانات کے ایک کلرک کی مٹھی گرم کرکے نکلوایا تھا۔کارڈ دو نمبر تھا۔بابو نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہی کارڈ خالو کی خدمت اقدس میں پیش کیا۔رزلٹ کارڈ کو قبولیت ملی تو دوستوں میں خوشی کی

لہر دوڑ گئی۔ بابو کے ہاں پہنچے، خالو کو مبارک باد دی۔ خالو نے اتنی سی دیر میں مٹھائی منگوالی تھی۔ بابو کو نقد انعام بھی دیا۔ بابو کے دوستوں کی پیٹھ ٹھونکی۔ فراخ دلی سے سب کی تعریف کی، خصوصاً گھوڑے کی۔

اسی شام پھر انور کو جھٹکا لگا۔ بابو مٹھائی کی پلیٹ کو کپڑے سے ڈھانپے شفو کے دروازے پر کھڑا تھا۔ انور جاسوسی کے لیے ایک طرف رک گیا۔ ذرا فاصلے پر، شفو کی والدہ جگت ماسی تھی۔ اسی نے مٹھائی وصول کر کے بابو کو ڈھیروں دعائیں دیں۔ خالی پلیٹ میں دعائیں ڈلوا کر وہ مڑا تو انور کو سامنے پایا۔ گڑبڑا سا گیا، پھر سنبھل کر بولا ''خوشی کو بانٹنا چاہیے۔ یہ میرے لیے اتنا غم کرتی ہیں۔''

بابو گریڈ 22 کا عاشق تھا۔ گھر استاد شفو کا تھا۔ انور کے شک کا ازالہ نہ ہوسکا ''زوئے اپنا جان کو اتنا جمعہ خان مت ڈالو۔ تم ماسی پر آسرا تو نہیں مارتا۔ میرے استاد کا ماں ہے، خیال کرنا۔''

بابو خفت سے بولا ''یار کو چرائی مت کرو۔ یہ ہمارا ماں کا برابر ہے۔ تم کیسا بات کرتا ہے، کچھ خیال کرو۔''

ماسی اور بابو؟ بات کچھ جچی نہیں۔ انور نے ذہن سے خیال جھٹک دیا۔ ممکن ہے کہ اپنی جلالی ماں سے اُکتا کر وہ ماسی سے ممتا مانگنے جاتا ہو۔ ماسی یوں بھی بڑی نیک اور محبت والی شخصیت تھی۔ بابو چوں کہ چند برس ہوئے اس علاقے میں آیا تھا، اہل محلہ اسے نان لوکل سمجھتے۔ آپس میں تو ایک دوسرے کے گھر آجا سکتے تھے مگر بابو کو اپنے گھر کے اندر کوئی بھی جانے کی اجازت نہ دیتا۔ حتیٰ کہ شادیوں کے موقعے پر وہ سب خواتین کے حصے میں کھانا serve کرتے مگر بابو کو رسائی نہ ملتی۔ یوسف پیدائشی بونا تھا۔ لڑکیاں اسے بچہ سمجھ کر محفل میں قبول کرلیا کرتیں۔ اس سے چہلیں بھی کرتیں۔

امتحان میں فیل ہونے کے بعد بابو نے زیرو زیرو ویبون والی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ دن چڑھے کالج پہنچتا۔ جاتے ہی کینٹین میں یا درختوں کے نیچے محفل جماتا۔ شعر و شاعری اور فلموں پر بات چیت ہوتی۔ موڈ بنا تو ایک آدھ پیریڈ اٹینڈ کر لیتا۔ پھر بڑے میاں کی دکان پر آبیٹھتا۔ گزرنے والی لڑکیوں کے ایکسرے لیتا، جو چھٹی کے بعد گھر جایا کرتیں۔ اس کے بعد ٹہلتا ہوا گھر چلا جاتا۔

مگر پھر یک لخت بابو نے سب اینٹی سوشل حرکات چھوڑ دیں۔ اچانک ہی وہ نہایت شریف ہوگیا۔ اس عجیب سی تبدیلی کو پہلے تو وہ محسوس نہ کرسکے، مگر پھر انھیں اندازہ ہوا کہ بابو کا ضرورت رشتہ والا خانہ پُر ہوگیا ہے۔ کوئی مل گئی ہے، جسے دوستوں سے چھپایا جارہا ہے۔

ایک روز نذیر نے اسے ٹٹولا۔ "ڈومی سائیل بھائی! کوئی چکر ضرور ہے۔ ہم شف شف نئیں بولے گا۔ تمھارا ساتھ کسی لڑکی سے لین فٹ ہوگیا ہے۔ ہم کو مالوم پڑتا ہے۔"

بابو نے اقرارِ محبت کرلیا۔ ایک آہ سرد کھینچی، جس سے وہ سبھی ہلاک ہوتے ہوتے بچے۔ "میری آئیڈیل مجھے مل گئی ہے۔"

سبھی سناٹے میں آگئے۔ انور کی آنکھوں میں ماسی کا پُر شفقت چہرہ گھوم گیا۔

گھوڑا بدک اُٹھا۔ "زدیے مخا مخ بولو، شالو بالو مت کرو۔ تم انسان ہے کہ داشتی کا گدھا۔ سیدھا بات کرو، کون ہے؟"

"بس وہ ایک لڑکی ہے، معصوم سی بھولی بھالی سی۔"

انور نے سکون کا سانس لیا۔ سبھی بابو کے سگریٹ پی رہے تھے۔ چائے کی ادائیگی بھی وہی کیا کرتا، لہٰذا محفل پر بابو ہی چھایا رہتا۔ افشائے راز کا خوف مٹانے کے لیے انھوں نے بابو کو تسلی دے ڈالی۔

"نام نہیں بتاؤں گا بس، اور جو چاہے پوچھ لو۔"

"اور کیا ہم اس کا قدر پوچھے؟ شناختی کارڈ پوچھے؟"

بابو کو محبت کا لیٹر بکس مل چکا تھا۔ جس میں وہ دھڑا دھڑا خط ڈالے جارہا تھا۔ شازیہ کے برعکس یہ پُرامن محبوبہ تھی۔ نہ لڑائی، نہ جھگڑا۔ دوستوں نے بابو کو مبارک باد دی کہ اسے اس کی منزل مل گئی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا:

love is God & God is love

بابو اپنی Godess کے خیال میں مگن رہتا۔ دوستوں کو البتہ خوشی ہوئی کہ بابو پھر اپنے میں مگن رہنے لگا تھا۔ دوستوں پر خرچ کرتا، خوش خوش رہنے لگا تھا۔ تعلیم سے البتہ کوسوں دور تھا۔ اس

صورت حال پر کبھی خوش گوار تبصرے کیا کرتے۔

پُراسرار طور پر زمبیا نے اظہار کیا: "پہلے تمھارا اکبری گم تھا۔ ابھی لائیں مارتا ہے۔ واہ محبت زندہ رہتی ہے۔ محبت مر نہیں سکتی۔"

بابو سے دعوت طلب کی گئی۔ بابو نے معذرت کی کہ وہ اس خوشی میں میں کل کھانا کھائے گا۔ آج جیب خالی ہے۔ گھوڑے نے ترت ادھار دے دیا۔ گھوڑا تھوڑی بہت شارٹ ہینگ بھی کیا کرتا تھا۔ جس سے بہت کچھ کما لیا کرتا۔ لال کباب میں کھانا کھا کر وہ پیدل ہی گھر لوٹے۔ ایک بار پھر بابو کو مبارک باد دی۔ بابو خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

زندگی گرلز اسکولوں سے نکل کر ویمن کالج کے گرد طواف کر رہی تھی۔ بابو ساکت ہی زندگی میں کھڑا تھا۔ زمبیا اوور سیئر بننے کے لیے پولی ٹیکنیکل کالج میں پڑھ رہا تھا۔ زمبیا کو پیار سے وہ اوور سیئر کی بجائے 'اوور سوز' کہا کرتے۔ بابو دھڑا دھڑا فیل ہوتا چلا گیا۔ لیکن استاد گھوڑے کے طفیل پاس کے کارڈ ملتے رہتے۔ بعض ایک پر تو یہ مژدہ جاں فزا بھی تحریر ہوا کرتا کہ بابو نے امتحان میں پوزیشن بھی لی ہے۔ خالو کے حساب کے مطابق بابو ایم اے انگلش میں انور کا ہم جماعت تھا جب کہ بابو صرف میٹرک پاس تھا۔ وہ بھی تھرڈ ڈویژن۔

انور اور بابو دونوں ایک روز پیلن کاریز میں پی رہے تھے کہ بابو نے سوال کیا: "میں تمھیں ساتھ ساتھ کیوں رکھتا ہوں؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"تم مجھے اتنے اچھے کیوں لگتے ہو؟"

"میں نہیں جانتا۔"

بابو پی کر بہک رہا تھا۔ پیلن کاریز سے اٹھنے والی ہواؤں اور درختوں کی مہک نے فضا دو آتشہ کر رکھی تھی۔

"سوچتا ہوں کب تک دوستوں سے چھپاؤں۔ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں تمھارے استاد شنو کی بہن نسیم سے محبت کرتا ہوں۔ محبت کیا، عبادت کرتا ہوں۔ میری محبت پاکیزہ ہے۔ اس پانی کی طرح۔"

اس نے وہسکی کی طرف اشارہ کیا۔ پھر ڈیم کی جانب انگلی موڑی۔

خوف کے مارے انور کے ہاتھوں میں گلاس لرز گیا۔ انور بدحواس ہوگیا۔ سارا نشہ پل بھر میں ہرن ہوگیا۔ "یار تم ہم کو بھی مروائے گا۔ استاد شفو خطرناک باکسر ہے اور اس کا بھائی لطیف آرمی کا نامی گرامی باکسر ہے۔"

"اسی لیے تم کو ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہوں۔ تمہارے ہوتے ہوئے استاد حملہ نہیں کرے گا۔ کیا بھی تو تم سنبھال لو گے۔"

"دیکھو بابو۔۔۔۔ دوستی اپنا جگہ، شفو ہمارا استاد ہے، زیادہ شالو بالو مت کرو۔ آخر تمھارا کیا صلاح ہے۔"

"میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

نسیم انور کے سامنے پلی بڑھی تھی۔ اسے کبھی غور سے دیکھا بھی نہ تھا۔ کچھ دیر تو اسے غصہ آتا رہا۔ یہ کوئٹہ ڈومی سائیل اس کے استاد کی بہن سے محبت کیوں کرنے لگا ہے۔ پھر سوچا کہ آخر نسیم کی کسی سے شادی ہونا ہی تھی، بابو میں کیا حرج ہے۔ اچھا بھلا وحید مراد ٹائپ کا چاکلیٹی ہیرو ہے۔ تبھی وہ شفو کی دہلیز پر پایا جاتا تھا۔

آخر یہ عقدہ کھلا کہ انور کے علاوہ وہ دوستوں کو پہلے ہی یہ روح فرسا خبر دے چکا تھا۔ انور کو بھی ان مہمات میں اب شامل ہونا پڑا۔ پہلے تو دروازے پر ہی خطوط کا تبادلہ ہو جایا کرتا۔ بابو کسی فن کار ڈاکیے کی طرح اپنا طویل و عریض بھاری بھرکم خط نسیم کے حوالے کرتا۔ وہ اسے ڈاکٹری نسخے نما خط تھما دیتی۔ بابو ڈیلیوری بیٹ سے تیزی سے غائب ہو جاتا۔ ہوٹل میں خط کو بار بار پڑھتا رہتا۔ ابتدا میں میڈیکل اصطلاح کے مطابق خط SOS تھے پھر BD ہوئے۔ یعنی ایک خط صبح، ایک رات۔ مگر کچھ ہی عرصے بعد تھراپی بڑھ گئی، خط TDS ہو گئے۔ ایک صبح، ایک دوپہر، ایک شام۔

ایسا ہنگامہ خیز عشق کہاں چھپائے چھپتا۔ رفتہ رفتہ زمانے کو خبر ہو گئی۔ لطیف باکسر نے ایک شام بابو کو اپنی دہلیز پر دیکھ لیا۔ وہ فوج کا ریٹائرڈ باکسر تھا۔

"دیکھو بابو! آئندہ اگر تم میرے دروازے کے پاس نظر آئے تو تمھاری ہڈی پسلی ایک

کر دوں گا، سمجھ گئے!"

بابو نے ادب سے سر جھکا کے، عرض کی۔" سمجھ گیا" اور چلتا بنا۔

حالات اب کشیدہ ہو رہے تھے۔

ایک بار وہ ہوٹل گئے تو شفو استاد کی بابو پہ نظر پڑ گئی۔ وہیں سے للکارا۔" زوئے، کٹ کٹ کیا دیکھتا ہے۔ خر بوتل۔"

پھر شفو حملے کے لیے آگے بڑھا۔ بابو گھبرا کے انور کے پیچھے چھپ گیا۔ انور نے استاد کو بہ مشکل روکا۔" استاد چلو۔۔۔ چمنی میں بات کرتے ہیں۔ ہمارا خاطر چھوڑ دیو۔ تمھارا ساتھ قصہ کرے گا۔"

شفو استاد گرج برس رہا تھا۔ وہ بابو کو گھونسوں پہ رکھنا چاہتا تھا۔" زوئے ایسا بزنا ٹیں دے گا، تم یاد کرے گا۔"

دوستوں نے بالآخر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ مگر بابو مسلسل خطرے میں گھرا ہوا تھا۔ دوستوں نے اسے سرزنش بھی کی کہ نالائق کسی عام سے گھرانے کی لڑکی سے عشق کرتے۔ یہ خطرناک باکسر تو تمھیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دے گا۔ مگر بابو عاشق صادق تھا۔ اپنے دور کا مستیں توکلی تھا۔ اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ البتہ وہ شفو اور لطیف سے خائف ضرور تھا مگر دیدار بازی، رب راضی اور ترسیل خطوط کا سلسلہ زور و شور سے جاری تھا۔ بابو نے ہوشیاری، مہارت اور چابک دستی سے محبت کی میل لائن قائم رکھی۔ بابو دن میں تین بار بھاری بھرکم خطوط نسیم کو دیا کرتا اور جواباً ڈاکٹری نسخے جیسا چند لکیروں پر مشتمل خط جس پر کبھی تو صرف ایک شعر ہوا کرتا، درِ جاناں سے وصول پاتا اور جھومتا رہتا۔

ایک بار بابو جان پر کھیل گیا۔ کسی پوسٹ مین کی طرح خط لیے جا رہا تھا کہ لطیف سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ بابو نے بڑھ کر مقتل میں سر پیش کیا۔ لطیف نے گھرکی دی تو بابو نے ادب سے عرض کیا۔" مجھے مار پیٹ کر آپ کو کیا ملے گا؟ میں تو نسیم سے شادی کر کے آپ کا مستقل خادم بننا چاہتا ہوں۔ سر حاضر ہے، قصاب ہیں تو سر اتار دیں۔ سوداگر ہیں تو جرمانہ کر دیں۔ مارشل لا والے جرنیل ہیں تو کوڑے ماریں، نسیم کے بھائی ہیں تو بڑھ کر مجھے گلے لگا لیں، اپنا ہے پھر بھی اپنا۔ بڑھ کر گلے لگا لیں۔" بابو ترنم پہ اتر آیا۔

لطیف نے سوچا کہ کہا تو ٹھیک ہی ہے۔شادی کا سوچا جا سکتا ہے۔ادھر گھر میں نسیم بھی بابو سے شادی کے لیے دباؤ ڈال رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔تم والدین کے ذریعے باقاعدہ رشتہ بھجواؤ اور میرے دروازے کے چکر یں لگانا بند کر دو۔ورنہ اچھا نہ ہوگا۔میری شرافت کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔"

اس رات بابو بہت خوش تھا۔سب کو پلائی۔کسی نے ٹوسٹ کیا!"بابو کی محبت کے نام۔"بابو بھی جھوم رہا تھا۔"مولا بھیج سونے کی توپ، چاندی کا گولا۔۔۔محبت جیت گئی۔حق کو ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔" سب نے پُر زور تائید کی۔

پھر بابو انور اور زمبیا پر برس پڑا۔"تم محبت نہیں کر سکتے۔ہوس کے پجاریو، تم محبت کرنے والوں کو بدنام کرتے ہو۔ہرجائی، بے وفا، فراڈی۔"

زمبیا کا رنگ سرخ ہوگیا۔"زوئے ہمارا سر خراب مت کرو۔تم خود آخر ایک دن پچھتائے گا۔لیلیٰ مجنوں بھی خرپاگل تھے۔کیا ملا مجنوں کو جو ہم کو نہیں ملتا۔"

انور نے بھی زمبیا کی حمایت کی۔"زوئے صحیح بولتا ہے۔آخر تم کو کیا ملے گا۔تم کتنا خوار ہے۔ کتنا ٹکر ٹکر ہے، زوئے ہر امتحان میں فیل ہوگیا۔تھرڈ ڈویژن میٹرک۔"

بابو خاصی چڑھا چکا تھا۔"میں عشق میں ایم اے، وفا میں پی ایچ ڈی اور محبت کی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں۔محبت نامے کا ماہر ہوگیا ہوں۔محبت کی دنیا کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہوں۔"

نذیر نے مشورہ دیا۔"ایک ڈبہ لے کر ڈاک خانے کے باہر بیٹھ جاؤ۔لوگوں کے خط مط لکھا کرو۔"

بابو کسی کی سنتا کب تھا۔وہ فنافی الشیخ کی طرح فنافی النسیم ہو چکا تھا۔اب ناقابل اصلاح تھا۔اس کا سفر محبت بہ جانب منزل جاری و ساری تھا۔

بابو نے اچھی خاصی چڑھائی ہوئی تھی۔گھر پہنچا تو بابو نے اسی جوشِ جہاد میں ہلا بول دیا۔ اتنی پی جو رکھی تھی۔والدین سے کہا کہ فوراً نسیم کا رشتہ مانگیں۔اس کی والدہ برس ہا برس کوئٹہ میں رہنے کو باوجود سخت راجستانی تھی۔اس کے خون میں بلوچستان سے عداوت بھری ہوئی تھی۔اس نے ڈنکے

کی چوٹ پر اعلان کیا کہ ہر گز یہ شادی نہیں ہونے دے گی۔ خالو بھی آپے سے باہر ہو گیا۔ گھمسان کا رن پڑا، جو تم بیزار ہوئی۔ آخر والدین کا پلہ بھاری رہا۔ بابو چند برتن ٹیخ ٹیخ کو توڑنے کے بعد واصل کمرہ ہوا۔ کنڈی لگا کر ایک درد بھرا محبت نامہ لکھنے لگا۔

"جان سے پیاری نسیم! صدا پھولوں کی طرح مسکراتی رہو۔۔۔۔"

بابو کی کھلم کھال بغاوت علاقے بھر میں مشہور ہو گئی۔ زمبیا تک خبر پہلے پہنچ گئی۔ وہ کالج میں انور کو تلاش کرتا، کلاسوں میں جھانکتا پھرا۔ آخر انور کو لیکچر میں سے اٹھا لایا۔ کشاں کشاں وہ کینٹین کے درختوں کی چھاؤں میں آبیٹھے۔ دور سے کوئٹہ ایکسپریس کی دھمک آرہی تھی۔ زمین میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ سیٹیاں بجاتا انجن سریاب کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"کل بابو نے پھڈا کر دیا، بولتا ہے ہم نسیم سے شادی کرے گا۔ خالو کا بکری گم ہو گیا۔ صبح صبح ہم کو بلایا، خر جلالی ہے۔"

"خالو ماذ پاگل ہے۔ راجھستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے، بابو کا۔"

ابھی یہ گفت و شنید جاری تھی کہ چند مزید دوست بھی آگئے۔ اتنے میں اپنے نحیف و نزار ہنڈا سی سی-70 پر بابو بھی پہنچ گیا۔

سارے دوست اس چوکور میز کے گرد بیٹھ گئے اور چوکور میز کانفرنس ہونے لگی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ بابو نے چند روز قبل ہی فلم مغل اعظم دوبارہ دیکھی تھی۔ وہ شہزادہ سلیم کے ڈائیلاگ بولتا چلا جا رہا تھا، جب کہ خالو کے تیور پرتھوی راج والے تھے۔

"بابو! تم نے اپنا جان کو کیوں مصیبت میں ڈالا، خالو تم کو شادی کے لیے نہیں چھوڑے گا۔"

عشق کی دُھن میں بابو کے تو قدم زمین پر نہ پڑے۔ گرج کر بولا۔ "چاہنے والوں نے تو محبت میں جان دی ہے، میں نسیم کے لیے مرنے کو ترجیح دوں گا۔ کہہ دو میرے باپ سے مجھے توپ سے باندھ کر اُڑا دے۔ میرے جسم کا ایک ایک ذرہ پکارے گا؛ نسیم۔۔۔۔نسیم۔۔۔۔" پھر ایک لمبی تان کھینچی؛ "نسیم!"۔

"تمہارے ایک ایک ذرے کو شفو بنا ئیں مارے گا۔ یار تم کیا جنجالی عاشق ہو۔ ایک طرف دو باکسر، ایک طرف اکبر بادشاہ یعنی خالو۔ تم ہم کو بھی مروائے گا۔"

معاملہ خاصا الجھا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ استاد گھوڑے سے مشورہ لیا جائے۔ امکانات تھے کہ خالو اشتعال میں آکر بابو کا خرچہ بند کر دے گا۔ گجرا کر بھی اسکوٹروں، موٹر سائیکلوں پہ گھوڑے کے دفتر پہنچے۔ وہاں ریلوے لائنوں کی حدود میں موٹر سائیکل لے جانے کی ممانعت تھی۔ مگر ٹرین دھونے والوں کا افسر بھی گھوڑا ہی تھا۔ لہٰذا وہ دوستوں کو جانے دیتے بلکہ ادب سے پرے باندھے سلام بھی کرتے چلے جاتے۔

گھوڑے نے جو ایک ساتھ سب کو دربارِ گھوڑیہ میں حاضر ہوتے دیکھا تو خوشی سے ہنہنانے لگا۔ فوراً ماتحتوں کو کڑک چائے بنانے کے احکامات صادر فرمائے۔

"بھوکوں کو تو کھانا کھلانا بڑا ثواب ہے۔۔۔۔ بابا۔" زمبیا نے بڑی دردناک آواز نکالی۔

بابو سیخ پا ہو گیا۔ "کیا مستونگیوں کی طرح ڈیڑھ دو بجے بھی کھانے کی بجائے چائے ہی پیش کرتے ہو۔ ہم کو امداد ہوٹل میں کھانا کھلاؤ۔"

زمبیا بھی اکڑ گیا۔ "ہم تمہارے باپ کے نوکر ہیں جو اتنی دور سے آئے ہیں۔ کھانا تو تم کو کھلانا ہی پڑے گا۔"

گھوڑے کے پاس پیسے نہیں تھے۔ زمبیا نے اس کی سے گھڑی گروی رکھ کے رقم ادا کر دی۔ یہ گھڑی گھوڑے نے ایک فلاشر سے جیتی تھی۔ کئی دنوں سے زمبیا کی اس گھڑی پر نظر تھی۔ گھوڑا بڑا بچہ خوش تھا۔ زمبیا کو شک تھا کہ گھوڑا کسی طرح دارلونڈے کو گھڑی بخش دے گا۔ یا کوئی لڑکا از خود چھین کر فرار ہو جائے گا۔

ہوٹل قریب ہی تھا۔ کھانا لگا تو باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ گھوڑے نے بابو کو اس کے جذباتی پن پہ سخت سست کہا۔ بابو بڑا کافر عاشق تھا۔ کچھ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ گھوڑے نے تجویز پیش کی کہ شام کو بابو دوستوں کے ساتھ نکل جائے۔ وہ خالو سے ملے گا اور لطیف سے بھی۔ ان دونوں کا درجہ حرارت معلوم کر کے وہ مستقبل کا لائحہ عمل طے کرے گا۔

شام کو گھوڑا جو آیا تو خالو نے انور کو بھی بلوا بھیجا۔

گھوڑا لاکھ ہنہنایا مگر خالو ٹس سے مس نہ ہوا۔

"یہ شادی میری لاش پر ہوگی۔" خالو نے انور کو بھی قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ حالاں کہ خالو کا مستقبل قریب میں فوت ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ لاش چھوٹی سی ہوتی، اس پہ کیا بارات بجتی۔

"بابو خودکشی بھی کر سکتا ہے۔" انور نے خالو کو اندیشوں سے ڈرانا چاہا۔

"شوق سے کرلے۔ ایسے ناخلف بیٹے سے بہتر ہے کہ انسان کے اولاد ہی نہ ہو۔"

گھوڑا لاکھ پھیرا بھی مگر خالو کے سامنے اس کا جادو نہ چل سکا۔ خالو باتوں کا دھنی تھا، چومکھی لڑا اور جھاڑ پلائی کہ دوست بابو کو کیوں نہیں سمجھاتے۔

خودکشی کے امکانات سے ڈرانے کے بعد گھوڑے نے پینترا بدلا "خالو وہ آپ کی بات نہیں سمجھتا تو ہمارا بات کیا سمجھے گا۔ وہ نسیم کا لیے پاگل ہوگیا ہے، آپ کا ایک لڑکا ہے۔ آپ اس کا بات مان لیو۔"

خالو مہربان ٹانگے والے کی طرح بابو کو بے نقط سنانے لگا۔ راجھستانی زبان میں ہزار ہزار پاؤنڈ کی گالیاں برسانے لگا۔ چوں کہ بابو اس کا بیٹا تھا، اس لیے گالیاں سینسر شدہ تھیں۔ مبادا بابو کی ماں یا بہن کو لگ جائیں۔ روئے سخن نسیم کے گھرانے کی جانب رہا۔ خالو نے ان کے آبا و اجداد پر بھی سیر حاصل تقریر کی۔

بابو نہایت بے تابی سے دونوں کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کی ہٹ دھری پر سخت افسوس ہوا۔ گھوڑے نے تجویز پیش کی کہ بابو کچھ عرصہ کے لیے بیمار بن جائے۔ خالو کا دل پسیج جائے گا۔ بیمار کرنے کے لیے تھانہ روڈ پر اسے کافی مقدار میں تلی ہوئی کلیجی کھلائی، لسی پلائی۔

منہ اندھیرے ہی خالو نے بلوا بھیجا۔ معلوم ہوا کہ بابو فوت ہونے والا ہے۔ خالو کی اپنی حالت نازک تھی۔ رنگ فق تھا۔ چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آواز گلوگیر ہی تھیں۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

دل دوز چیخ ماری: "بابو۔۔۔۔میرے بیٹے۔"

جواباً بابو نقاہت سے کراہا۔" ابا۔۔۔ میرے ابا، میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو رہا ہوں۔۔۔ الوداع، مجھے یاد رکھنا۔۔۔ ابا۔ فقط آپ کا تابع دار بیٹا: بابو۔۔۔ میرے بعد کسے بیٹا کہو گے۔ کچھ پھول تو کھلتے ہیں مزاروں کے لیے۔"

بابو بے خیالی میں" محبوبہ کا دل پگھلانے والے پُراثر فقرے" نامی کتاب کے الفاظ دہرانے لگا تو سبھی دوست گھوڑے کے اشارے پر بابو کو ہسپتال لے گئے۔

بابو نے گھر سے نکلتے ہوئے بھی ماں پر آخری وار کیا۔" اماں، اب میں زندہ واپس نہ آؤں گا۔۔۔ زندہ باد، زندہ باد، اے محبت، زندہ باد۔۔۔ مرجاتے ہیں عاشق، زندہ رہ جاتی ہے یاد۔" بابو نقاہت سے گنگنانے لگا۔ بہنیں رونے لگیں، ماں پچھاڑیں کھانے لگی۔

بابو کو دوستوں نے ایمرجنسی میں پہنچایا اور لڑجھگڑ کر زبردستی وہاں سے وارڈ میں داخل کرا دیا۔ گھوڑے نے سب دوستوں کو ناشتہ کرایا۔ بابو کے بستر کے گرد بیٹھے وہ وقت گزاری کے لیے گھومتی پھرتی نرسوں کی اناٹومی پر غور کرتے رہے۔ آنکھوں سے ان کی ایکسرے لیتے رہے۔ حیرت ہو رہی تھی کہ سب عورتیں ایک جیسی ہیں۔ پھر کسی ایک پر عاشق ہونے کا بھلا کیا جواز۔ کسی کا دہن ماتھے پر ہو، کسی کی چار آنکھیں، آٹھ ہونٹ ہوں تو چلیے جواز بھی بنتا ہے مگر دو ٹانگوں کے فریم پہ جڑے Chasis کی ایک سی عورتیں۔ ایک کا عاشق بابو بھی تھا۔ کمال ہے!

ڈاکٹر آیا تو دیکھ بھال کر بولا۔" مبارک ہو، آپ کے دوست کو کوئی بیماری نہیں ہے۔"

غم سے ان کے منہ لٹک گئے۔ جس پر ڈاکٹر کو حیرت ہوئی۔

دوستوں نے عرض کیا۔" ایک دو روز آبزرویشن میں تو رکھیں۔"

ڈاکٹر نہ مانا تو انھوں نے سارا افسانہ عشق ڈاکٹر کو سنایا۔ ڈاکٹر بھی کبھی دھانسو عاشق رہا ہوگا۔ اب بھی شکاری نظروں سے نرسوں کو تاک رہا تھا، جیسے قصائی کی دکان کے باہر بیٹھا کتا حسرت و یاس لیے ہڈیوں پہ لگی بوٹیاں دیکھتا ہے۔ مگر تھا وہ بھی زندہ دل انسان۔ اس نے ساتھ دینے کا وعدہ کرلیا۔

زمبیا اسکوٹر پر خالو کو لے آیا، جلدی سے۔

بابو آنکھیں موندے حالتِ نزع میں تھا۔

"میرے بیٹے کو بچا لو۔۔۔ڈاکٹر! کیا ہو گیا میرے بیٹے کو۔"

دوستوں نے تو اِدھر ڈاکٹر کی خاصی منت سماجت کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر اپنے پیشے کی متانت کو فراموش کر کے ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے خالو کو بتایا کہ انسانی جسم کا سب سے اہم حصہ دل ہے، حالاں کہ مرد کچھ اور سمجھتے ہیں۔ بابو کا دل سخت متاثر ہوا ہے۔ موقع غنیمت جان کر گھوڑے نے گیس کا خالی سلنڈر بھی بابو کے بیڈ سے لگا دیا تھا۔

"اس کے دل کو صدمہ پہنچا ہے۔ شاید کسی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آپ ہاں کہہ دیں۔ ورنہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ خدانخواستہ مر بھی سکتا ہے۔"

کہاں تو خالو آب دیدہ تھا، چہرے پہ حزن و ملال تھا۔ کہاں چشم زدن میں طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ ترت آبِ گم میں بدل گیا۔ "مرتا ہے تو مر جائے سالا۔ میں اس کی شادی نسیم سے نہیں ہونے دوں گا۔ بول تجھے کون چاہیے۔ پیارا ابا۔۔۔ یا نسیم۔"

بابو جھٹ ٹھا کر بیٹھ گیا اور باپ جیسے ٹھٹھکے سے گوہر افشانی کی۔ "نسیم!"۔

خالو پیر پٹختا وارڈ سے نکل گیا۔ دوست بھی بابو کو لے کر چلتے بنے، ورنہ ڈاکٹر نکال باہر کرتے۔

بابو کا خرچہ بند ہوا تو بے کس دوست بھی مارے گئے۔ وہ عیش و آرام خواب ہوئے۔

کچھ دنوں یہ سرد جنگ چلتی رہی۔ ایک سہانی صبح خالو کا دل بھر آیا۔ بولا، "بابو! تم نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ جاؤ کچھ دن رشتہ داروں سے مل آؤ۔ چچا بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ لو پیسے، کچھ تفریح بھی کر لینا۔ حیدر آباد کو موسم بھی صحت کے لیے اچھا ہے۔"

بابو نے ترنت رقم قابو کی۔ اس کا خیال تھا کہ حیدر آباد میں رشتہ داروں سے مل آئے گا۔ رقم معقول تھی، نسیم کے لیے تحفے بھی لائے گا۔ اسی شام ہنگامی بنیادوں پر نسیم سے سیڑھیوں والی ملاقات کی یعنی دہلیز پر کھڑے ہو کر شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ انور کو قریب ہی رکھا کہ مبادا اشفو آ نکلے یا لطیف سے مڈبھیڑ ہو تو انور بیچ بچاؤ کرا دے۔ بابو ڈائیلاگ کا بادشاہ تھا۔ دروازے کی اوٹ لیے نسیم کھڑی تھی۔ بابو نثر میں نظم کے ٹوٹے بھی چلا رہا تھا۔

"نسیم میں اس جہانِ فانی سے جا رہا ہوں۔ یعنی تمھارے شہر سے کل دو بجے روانگی بارات ہے۔ تمھارے لیے کیا لاؤں؟"

وہ جانے کیا بولی۔ بابو کی تقریر البتہ واضح تھی۔

"تم پوری سامنے آؤ اور یہ دوپٹہ کیا اوڑھ رکھا ہے۔ مجھ سے پردہ کرو گی کیا؟... عاشق کو دیکھتی ہو دوپٹے کو تان کے، دیتی ہو ہم کو شربت دیدار چھان کے..."

ریلوے اسٹیشن پر بابو نے وصیت کی۔ "مجھے آہوں اور سسکیوں کے ہجوم میں نہیں بلکہ قہقہوں میں رخصت کرنا۔ اگلے ہفتے لوٹ آؤں گا۔ تم سب کی لیے نایاب گانوں والی کیسٹیں بھی لاؤں گا۔"

پھر ایک ہفتہ تو کیا ایک ماہ گزر گیا۔ سبھی حیران و پریشان تھے کہ آخر ہوا کیا۔ ایسا تو نہیں وہاں کوئی نئی مکتوبِ الیہ مل گئی ہو۔ نسیم کے گھرانے سے انور کے تعلقات تھے۔ اسی ناتے ایک روز نسیم نے بلوا بھیجا۔ بہانہ بنایا کہ انگریزی کی ایک نظم سمجھ نہیں آرہی۔

سبھی محبت سے پیش آئے۔ انور، نسیم کو نظم سمجھانے بیٹھا، جو اسے خود بھی نہیں آتی تھی۔

اتنے میں چائے آگئی۔

موقع پا کر نسیم نے دو چار آنسو ٹپکائے، پھر آنسو پی کر بولی۔ "بھائی، تم میں اور شفو میں کبھی میں نے فرق نہیں رکھا۔ جاؤ اگر تم میرے بھائی ہو، تو بابو کو ڈھونڈ کے لاؤ۔ میرے والدین شادی کے لیے تیار ہیں۔"

انور متعجب ہوا۔ "تم بولتا ہے، والد بھی تیار ہے۔ قبرستان سے فون کیا تھا؟"

وہ روہانسی ہوگئی۔ "میں نے محاورتاً کہا تھا۔ میری والدہ اور لطیف بھائی رضا مند ہو گئے ہیں۔"

انور کو شفو کی فکر تھی۔ "تمھارا مہربان تانگے والا شفو، وہ کیا بولتا ہے، وہ تو اڑی کرتا ہے۔"

"وہ دل کا سادہ ہے، وہ بھی مان جائے گا۔ بھائی، تم کیوں اس سے باکسنگ سیکھتے ہو، سنا ہے تمھیں مارتا ہے، مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"ہاں صحیح بولتا ہے۔ اس نے ہمارا ناک منہ برابر کر دیا ہے۔ بہت بزنائیں مارتا ہے۔

ایسا شوٹ شوٹ۔"

نسیم کا دکھ دیکھ کر انور نے ارادہ کیا کہ برادرِ یوسف والا رویہ ترک کر دے۔ نسیم نے بتایا کہ پڑوس کی اسٹیشنری پر بابو نے دکاندار کے پتے پر خط بھجوانے کا وعدہ کیا تھا کہ نسیم کوئی کتاب کاپی خریدنے کے بہانے جایا کرے گی اور خط لے آیا کرے گی۔ مگر کوئی خط پتر نہیں آیا۔

بابو اتنے بڑے بڑے خط لکھتا تھا، لیو ٹالسٹائی کے ناولوں جیسے۔ کیا عجب ہے کہ اس کے خط کے وزن سے جہاز کہیں راہ میں گر پڑا ہو؛ جھنگ شاہی والے جہاز کی طرح۔ نسیم کو انور دلاسہ دے دلا کر نکلا۔ بڑی مشکل نظم تھی جواب اسے خود سمجھنا تھی۔

دوستوں کی تلاش میں کئی ایک ہوٹلوں میں جھانکا۔ سبھی غائب تھے۔ آخر گھوڑے کے آستانے پر مل گئے۔ ایک روپیہ بوٹ پر فلاش کھیل رہے تھے۔ پوری واردات اور نسیم کی دردناک و درد بھری کہانی انھوں نے توجہ سے سنی۔ حیدرآباد میں اُن دنوں انور کا ایک دوست صدیق بلوچ چھپا ہوا تھا۔ شجرہ باپ سے چلتا ہے۔ اس کے والد لدھیانہ کے مہاجر تھے اور ماں بلوچ۔ اپنا سکوپ بنانے کے لیے اس نے شجرہ ماں سے شروع کر دیا۔ یوں بھی کئی معاشروں میں Matriarchal Society قائم ہے۔ بلوچستان میں کسی چھوٹی قوم یا لسانی گروہ کو تیسرے درجہ کے شہریوں کا حق بھی نہیں ملتا۔ صدیق ایمان دار کی ایک سالہ زندگی کی نسبت بے ایمان کی سو سالہ کی زندگی گزارنے کا حامی تھا۔ سال میں ایک آدھ دھانسو فراڈ کر کے غائب ہو جاتا۔ سال بعد موسمِ بہار کی طرح پھر پلٹ آتا۔ بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خون گرم رکھتا۔ اچھے دنوں میں دوستوں کو کھلاتا پلاتا اور برے دنوں وہ فراڈیوں کا محمود غزنوی تھا۔ ایدھی کی طرح بات بے بات چندہ مانگتا رہتا۔ چندہ ماہ قبل جب کہ وہ ٹرک ڈرائیوری کر رہا تھا، کسی ٹھیکے دار کو مل سے چوری کا سیمنٹ ملا۔ اس نے صدیق پر اعتماد کرتے ہوئے چوری کا سیمنٹ اس کے ٹرک میں بھر دیا کہ کوئٹہ پہنچا دے۔ صدیق واقفِ واردات تھا۔ اس نے سیمنٹ کوئٹہ میں فروخت کر دیا۔ ٹرک، مالک کو واپس کر دیا۔ مالک سے پیشگی تنخواہ لے کر غائب ہو گیا۔ دوست صدیق کے خفیہ ٹھکانے سے واقف تھے۔ صدیق دوستوں سے مکمل رابطے میں رہتا، نئی وارداتوں سے آگاہ رکھتا۔ لوٹ کے مال میں سے کچھ حصہ، زکوٰۃ سے خاصا زیادہ دوستوں کو دیا

کرتا۔ طے پایا کہ انور فلاش کے میدان میں پانچ روپے نال اٹھاتا رہے گا۔ اسی روپے سے وہ حیدرآباد جا کر بابو کی سُدھ بُدھ لے گا۔ انور نے وعدہ لیا کہ بابو کو بازیاب کروا کے لائے گا۔ گھوڑے نے تھرڈ کلاس کی آمدورفت کا پاس بنانے کا عندیہ دیا۔

نال اٹھاتے اٹھاتے میدان کی نصف رقم انور کے پاس آگئی۔ گھر میں بہانہ بنایا کہ اتھلیٹک ٹیم کے ہمراہ حیدرآباد جارہا ہے۔ کچھ روپیہ والد نے بھی دیا۔ گھوڑے کے طفیل ٹرین میں سفر اچھا گزرا۔ صدیق کو باآسانی تلاش کرلیا۔ بابو کے چچا کا پتہ اچھے وقتوں میں لے رکھا تھا۔ اگلے ہی روز جانے کا ارادہ کیا۔ صدیق کو بھی علم نہ تھا کہ بابو حیدرآباد میں ہے۔ انور تو اس امید پر گیا تھا کہ صدیق کے پاس اتنا روپیہ ہے، خوب ٹھاٹھ سے رہے گا۔ مگر دیکھا تو وہ خود دیہاڑی دار رکشہ ڈرائیور ہے۔ ایک موٹے سے سیٹھ کے بہت سے رکشے تھے۔ وہ رات اور دن کے لیے ڈرائیور کو فکس ریٹ پہ رکشے دیا کرتا۔ رات کا کرایہ کم تھا مگر صدیق دن میں رکشہ چلایا کرتا۔ رات کے رکشے عموماً دلال اور پیشہ ور عورتیں بک کیا کرتی تھیں۔ صدیق کو وہ عورتیں ناپسند تھیں، لہٰذا دن میں ہی رکشہ چلایا کرتا۔ مگر جب کچھ رقم ہاتھ لگتی تو ان ہی عورتوں کے پاس چلا جاتا۔ اسے سیٹھ کو ہر شام رکشے کے ساتھ دن کا معاوضہ دینا پڑتا۔ جو کچھ باقی بچتا اُسے سیٹھ کی دختر نیک اختر پر خرچ کردیتا۔ ان کا زبردست جذباتی عشق چل رہا تھا۔ سیٹھ کی بھی نظرِ عنایت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ صدیق بلوچ جیسے مؤدب اور شریف جوان کو اپنا داماد بنالے۔ صدیق بچہ ڈب بھی تھا۔ موقع پاتے ہی اپنے میدان میں بھی شہ سواریاں کرتا، بوجوہ مفلسی کا شکار رہتا۔ سیٹھ کی بیوی نے صدیق کو منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔ محبوب کے لیے تھوڑی بہت انویسٹمنٹ کرکے پھر صدیق کسی نہ کسی بہانے کچھ رقم محبوبہ سے تو کیا، مستقبل کی ساس سے بھی اینٹھ لیا کرتا۔

صدیق کا پسندیدہ چینکی ہوٹل حیدرآباد کے پُل کے ساتھ تھا۔ وہاں وہ چائے پیتے رہے کہ تازہ دم ہوکر بابو کی تلاش میں نکلیں گے۔ معاً دیکھا کہ ایک جوان خودکشی کے ارادے سے پُل پہ لٹک جاتا ہے، پھر ہچکچا کر پیچھے ہٹتا ہے۔ پھر آگے بڑھتا ہے۔

انور نے پچھلی سیٹ سے چلا کر کہا "صدیق یار رکشہ روکو، یہ بوتل خودکشی کرے گا۔"

صدیق نے جھٹ رکشہ روکا۔ اس کا انجن بند کر دیا۔ جس سے اچانک کائنات میں سکون آگیا۔ کافی دیر تک وہ کھڑے رہے، آخر صدیق جھنجھلا گیا۔ "چھوڑ دیار۔ بابو کادرک نہیں ہے، پہلے اس کو تلاش کریں۔ رات کو فلاش بھی کھیلنا ہے۔"

انور نے ضد کی۔ "سارا دن یہ مہربان کا ٹانگہ چلاتے ہو۔ تھوڑا رک گئے تو کون سا تاوان بھرنا پڑے گا۔"

انور نے کسی کو پُل سے کودتے نہیں دیکھا تھا۔ اشتیاق تھا کہ کودے تو کوئٹہ جا کر یہ دعویٰ کر سکے کہ ان گنہ گار آنکھوں سے کسی کو خودکشی کرتے دیکھا۔ اتنا بڑا اعزاز کسی اور دوست کے پاس کہاں تھا۔

جب بہت دیر ہوئی تو صدیق جھنجھلا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سے بگل سا بنا کر نعرہ بلند کیا۔ "زوئے، جلدی چھلانگ مارو۔۔۔ہم کو دیر ہوتا ہے۔ کاروبار کا ٹیم ہے۔ دیری مت کرو۔ زوئے آسرا تاوان اے۔"

انور خودکشی کا آنکھوں دیکھا منظر محفوظ کرنے کے لیے رکشے سے نکل آیا تھا۔ پُل والا بندہ نعرہ لگا کر ساتھ ہی خودکشی کا ارادہ ملتوی کر کے پُل سے اترا اور ڈگ بھرتا ان کی جانب بڑھا۔

دیکھا تو وہ بابو تھا۔

دونوں دوڑ کر گلے ملے۔

اسی پھٹپھٹاتے، چنگھاڑتے، غراتے، دھواں اگلتے رکشے میں قریبی ہوٹل پہنچے۔

حال حوال ہوا۔

بابو نے بتایا اس کا حیدر آباد بجھوایا جانا ایک گھناؤنی سازش تھی۔

صدیق خفا ہوا۔ "زوئے اتنا مشکل اردو مت بولو، سیدھا بات کرو۔ گھناؤنی کو گولی مارو۔"

بابو نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کوئٹہ کی اردو میں بتایا کہ حیدر آباد پہنچا تو چچا نے ساری رقم چھین لی اور کہا کہ جب تک نسیم کا خیال نہیں چھوڑو گے، یہیں رہو گے۔ سدھر جاؤ گے تو یہیں تمھاری منگنی کر دی جائے گی۔ پھر سے وہی محبت دی جائے گی۔ کھانا گھر سے ملے گا اور ایک پیکٹ

سگریٹ ملے گا بس۔ ڈنڈے کے زور سے نماز بھی پڑھائی جاتی۔ چچا مسجد میں لے کے جاتا تو وہ دوسرے گیٹ سے غائب ہو جاتا۔ ایک دو بار مسجد سے چچا کے بوٹ بھی چرا کر قریبی نالے میں پھینک دیے۔

"تم کوئٹہ کیوں نہیں آیا؟ اُدھر تو تمہارا اتنا یار دوست ہے۔ خیر تی۔ تم لکو حیدرآباد سے آمرا ستادان اے۔ ریلوا اپنا چمنی میں ہم کوئٹہ کا آموختہ ہے۔ اُدھر مرے گا۔"

صدیق نے قہقہہ دیا۔ "یہ لو سگریٹ۔ کیٹ کرو، صبر یار کرو۔ تم بگٹی کیوں نہیں ہو گیا۔ جو حج بولو۔ کدھر گیا نسیم کا عاشق۔ ہم لوگوں کا باندی والی۔"

بابو نے اپنی دردناک کہانی سنائی کہ دمڑی پاس نہ تھی۔ بھاگتا تو زادِ راہ نہ تھا۔ بابو کو یہ ڈر بھی تھا کہ بلا ٹکٹ سفر کرنے کی کوشش میں پکڑا گیا تو بڑی سبکی ہوگی۔ کوئی چھڑانے بھی نہیں آئے گا۔ اس کی عمر کے قیدی سے سال ہا سال سے بند قیدی جو سلوک کرتے ہیں، اس کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔

صدیق نے کھلے میدان کی کرائے والی منجی بستر پہ انھیں سلایا، اور خود سیٹھ کے گھر پہنچ گیا۔ منہ بولی ماں کے پاؤں دبانے اور دیگر خدمات بجا لانے کے لیے۔

"صدیق خود بھی لنگ ولاش ہے، اس کے پاس زیادہ رکنا ٹھیک نہیں۔" بابو نے مشورہ دیا۔

اگلے روز صدیق نے انھیں زادِ راہ دیا۔ قلی سے تھرڈ کلاس کے دو برتھ خرید لیے اور عازم کوئٹہ ہوئے۔

انور نے دمِ رخصت فرمائش کی۔ "یار صدیق اس دفعہ حیدرآباد میں فراڈ کر کے کوئٹہ آجانا۔ ہم لوگ تمہارا لیے اداس ہیں۔ فلاش کا مزہ نہیں آتا۔"

صدیق نے تسلی دی۔ "بے غم رہو، انشااللہ جلدی آئے گا آپ کے شہر میں، ذرا سیٹھ کو لمبا کروں۔"

بہ صد خرابی بسیار وہ دونوں کوئٹہ ریلوے سٹیشن پہ اترے تو گھوڑے کے آستانے پہ حاضری

دی۔ مال بنانے کے لیے گھوڑا آدھی چھٹی ساری بھی نہیں کرتا تھا، شام تک بیٹھا رہتا۔

نعرہ مار کر وہ بابو سے لپٹ گیا۔" لگتا ہے تبلیغی جماعت میں بھرتی ہو گئے۔ یار یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔"

گھوڑے نے کچھ کھلایا پلایا، ریلوے ٹکٹ چیکرز ریسٹ روم میں دونوں نے غسل صحت کیا۔ بابو اپنی مجبور جوانی کی درد بھری کہانی گھوڑے کو سناتا رہا۔ مگر گھوڑے کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔" خرلغڑی! مار دیتے چھلانگ، جھگڑا ختم ہو جاتا، یا لنگڑے ہو جاتے، معذور ہو جاتے، جامع مسجد کے ساتھ بٹھا دیتے، ہمارا بھی خرچ چلتا رہتا۔ اب تم کیا کرو گے، صرف حیدر آباد کے پُل سے لٹکتے رہے۔ خرسست۔"

بابو مارے غم کے بوکھلایا ہوا تھا۔ سگریٹ پیے جا رہا تھا۔ خالو انور کا تو جانی دشمن تھا۔ گھوڑے سے خالو کے تعلقات البتہ ٹھیک تھے۔ طوائفوں کے ساتھ رہنے سے گھوڑا طوائفوں والی زبان بولنے کا ماہر ہو چکا تھا۔ آواز بھی کچھ کچھ زنانہ سی ہو گئی تھی۔ فوراً ہر کسی کا دل جیت لیا کرتا۔ بڑی میٹھی زبان تھی۔ یہ مٹھاس شوگر کے مریضوں کے لیے بھی مفید تھی۔ انداز بھی تماش بینوں والے تھے۔ اس لیے خالو گھوڑے کی بہت عزت کرتا۔ اسے بابو کا اصل دوست گردانتا۔ انور خالو کے سامنے نہ گیا۔ اس نے موت کے منہ میں سر دینا حماقت جانتے ہوئے گھر کا رخ کیا۔ نسیم سے اس کا وعدہ پورا ہو چکا تھا۔ بابو کو one piece میں واپس لے آیا تھا۔

انور کے فرار کے بعد چارو نا چار گھوڑا اکیلا ہی بابو کو خالو کے پاس لے گیا۔ خالو ٹیلی فون کے محکمے سے ریٹائر ہو کر اب اسی محکمے میں ٹھیکے داری کرنے لگا تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی فرقت میں نقد کی حالت ادھار کا انجام والی تصویر جیسا 'ادھار کا انجام' بنا بیٹھا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ عاشق دل گیر رسہ تڑا کے بھاگ نکلا ہے۔

محبت عود کر آئی۔ مگر ضبط سے پرچہ امتحان کی طرح پہلا اور لازمی سوال کیا۔" باپ چاہیے یا نسیم؟"

بابو فاقہ کشی سے کم زور ہو چکا تھا مگر اندر من کی بیٹری بدستور کام کر رہی تھی۔ رعب سے

بولا" دونوں۔"

گھر کے اندر جو بھنک پڑی تو ماں دوڑ آئی۔ گھوڑے نے تنبیہ کی۔" خالہ سنبھالو تمہارا لخت جگر، دردِ کمر، خودکشی کر رہا تھا۔ شکر کرو زندہ لے آیا ہوں۔ شکل دیکھو، جیسے قربانی کا بکرا۔ اتنا ظلم نہ کرو۔ خوامخواہ تمہارا ولی عہد سلطنت ہے۔ تم اس کو مردے کا مال سمجھتا ہے۔"

بابو زور سے بلبلایا۔" ماں، ماں۔۔۔ مجھے تم اپنے گلے سے لگالو، فقط تمہارا اپنا نا سمجھ بیٹا۔" بابو خلوط والی زبان بولنے لگا تھا۔

بابو تو رہا ایک طرف، میاں بیوی میں گھمسان کا رن پڑا۔ ماں کی حمایت میں تینوں بیٹیاں بھی محاذ جنگ میں کود پڑیں۔ گھوڑے نے اپنا منصوبہ کامیاب ہوتے دیکھا تو اگلا وار کیا۔" خالو، شاٹ ہو جاؤ میرے ساتھ۔" اس سے پہلے کہ خالو کچھ سوچتا گھوڑے نے خالو کا ہاتھ پکڑا، اور باہر نکل گیا

اسے فرح ہوٹل میں پیسٹری اور بسکٹ کھلائے۔ وہاں گھوڑے کا ادھار چلتا تھا۔ خالو کو گھوڑے نے Long Duel پر لگا دیا۔

" خالو! جوان بیٹا ہے، خودکشی کر لیتا اور لکھ جاتا کہ اس کے قاتل تم ہو تو کیا بنتا۔ تمہاری جوان بیٹیاں ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔"

گھوڑے کے تباہ کن ڈائیلاگ نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ شیر بلی بن کر گھر لوٹا۔ مگر بابو سے بدستور رو ٹھا رو ٹھا رہا۔

لاڈ پیار کے علاوہ بابو کا جیب خرچ خالو نے بند کر دیا۔ اس کو موٹر سائیکل بھی حیدر آباد کی جلا وطنی کے دوران بیچ ڈالا تھا کہ وہ موٹر سائیکل ایک فتنہ تھی۔ اسی پر بیٹھ کر بابو عشق فرمایا کرتا تھا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

بابو کی حالت تیسری دنیا کے اسلامی ملکوں کے جیسی تھی جن کے نام ساتھ تو جمہوریہ کا لفظ لگتا ہے مگر ہوتی ہے وہاں فوجی فاشزم۔ خالو بہ ظاہر تو اس کا باپ تھا مگر چپکے چپکے بابو کو زچ کیے جا رہا تھا۔ وار پہ وار کیے جا رہا تھا۔ کبھی گرلز کالج کے گیٹ کے پہلو میں چمنی پر جا بیٹھتا۔ تا کہ اگر بابو گیٹ پر نسیم سے ملنے آئے تو وہیں اس کی گردن ناپ لے۔ کبھی گھر کے باہر ٹہلنے لگتا کہ بابو وہ تھڑے والی ملاقات نہ کر سکے۔ خالو نے محلے کے بچوں کو ٹافیوں وغیرہ کی رشوت دے کر جاسوسی کا مضبوط اور نا قابل شکست نظام رائج کر دیا۔ ادھر کالج کے گیٹ کیپر کو بھی روپیہ لگا کر گانٹھ لیا کہ بابو کا پیام نسیم کو نہ دے۔ گیٹ کیپر بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ گھوڑے کے کہنے پر بابو کا بھی ساتھ دینے لگا۔ یوں وہ ڈبل کراس کرنے لگا۔

ایک روز انور ملاقات کے لیے بابو کو گرلز کالج کے گیٹ پر لیے جا رہا تھا۔ لب بام پہنچے تو بابو کرب سے چلا اٹھا: "واپس موڑو، بھاگو۔" مڑنے کا راستہ نہ تھا۔ انور نے اسٹیٹ بینک کی طرف

اسکوٹر موڑ دیا۔

"بابو! کسی بچھو نے کاٹ کھایا ہے کیا؟"

"نہیں یار، وہ دیکھو! تمہارا خالو گیٹ کے قریب چھپا بیٹھا ہے کہ رنگے ہاتھوں ہمیں پکڑے۔ ظالم صیاد!" بابو فرطِ غم سے گنگنانے لگا۔ "رحم کر آسماں..... رحم کر آسماں۔"

بابو کی زندگی کا سخت دور شروع ہو چکا تھا۔ سگریٹ دوستوں سے مانگتا۔ اُدھار لے کر فلاش کھیلتا۔ تمبولا کے لیے دوست چندہ کر کے بھجواتے، یا کاپی خرید دیتے۔ قرض کی مے پیتا۔ کئی بار دوستوں نے نصیحت کی، "زوے اتنا پری نہیں ہے کہ سارا عمر ادھار ملے، یہ عشق تمہارا اوارے میں نہیں ہے۔ عشق نے تمہارا تو کیا ہمارا بھی تختہ کیا۔"

مگر بابو دھن کا پکا تھا۔ کسی کی نہ سنتا۔ زمبیا کی محبوبہ کو دیکھ کر بابو نے تبصرہ کیا تھا: "گدھی پہ دل آیا تو پری کیا چیز ہے۔" زمبیا نے بے نقط سنائیں کہ کم از کم اس کا عشق پُر امن تو ہے۔ بابو کے عشق نے ایک زمانے کو خوار کر رکھا تھا۔ سب سے زیادہ خود خوار تھا۔

ان ہی دنوں صدیق خود ساختہ جلاوطنی سے واپس آ کر دوبارہ ٹرک چلانے لگا۔ جس سے دوستوں کے مالی حالات بہتر ہو گئے۔ گھوڑے کو بھی زرعی پوسٹنگ مل گئی؛ زروالی۔ وہ ریلوے گودام میں متعین ہوا تو ہاتھ دکھانے لگا۔ تاش میں شارپنگ کا عادی تھا۔ یہاں بھی طلسم ہوش ربا کا عالم تھا۔

ایک روز بابو نے صدیق کو مجبور کیا کہ بلبلی اور کچلاک کے درمیان ایک جگہ چلے۔ وہ دونوں اتنے بڑے ٹرک میں وہاں پہنچے تو نادر شاہی حکم جاری ہوا کہ ٹرک ایک جانب کھڑا کر کے پہاڑ پر ساتھ چڑھو۔ صدیق پینے پلانے والا شخص تھا۔ پہاڑوں پر کب چڑھا بھلا۔ اس کے بیان کے مطابق سر چکرانے لگا۔ نیچے گہرائی میں دیکھتا تو موت نظر آتی۔ اوپر چڑھنے کا یارا نہ رہا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ کسی نہ کسی طرح چوٹی پر پہنچا۔ دیکھا کہ وہاں ایک قبر پر مختلف جھنڈے لگے ہوئے ہیں۔ حیرت ہوئی جنازہ یہاں کون لایا ہوگا۔ اس زمانے میں تو ہیلی کاپٹر بھی نہ تھے۔ بابو آنکھیں بند کر کے دعائیں کرنے لگا کہ بابا میری شادی نسیم سے کرا دو۔

صدیق سخت جلالی ہوا۔ "زوے نماز تم پڑھتا نہیں ہے، خرد اشتی! اور بابا کو بولتا ہے شادی

کرادیں۔ باب نے کوئی شادی دفتر کھولا ہوا ہے۔ یہ دعا تو زمین سے بھی مانگ سکتا تھا۔ ابھی ہم واپس کیسے جائے گا؟ اگر دعاؤں سے شادی ہوتا تو ہر مولوی کا چار چار شادی ہو جاتا۔ زدے ان کا ایک بیوی بھی نہیں، طالب لوگ بے چارے خدمت خاطر کرتا رہتے ہیں۔"

صدیق تو بدعتی تھا۔ مگر بابو سچا اور صاحب ایمان مسلمان تھا۔ بابو نے سچے مسلمان کی طرح دلاسا دیا۔"اللہ مالک ہے۔" یہ بابو کا مشہور و معروف فقرہ تھا۔ بات بے بات وہ کہہ دیا کرتا، اللہ مالک ہے۔ بابو اب بزرگانِ دین کے پیچھے لگ گیا۔ کبھی اِس مزار کبھی اُس مزار پر۔ محرم میں دوست امام بارگاہوں میں جایا کرتے۔ وہاں کھانے پینے کو مفت ملتا۔ شربت اور کھیر تو بے حساب ملتے۔ سنی حضرات بھی دیگیں پکوا کر سڑکوں پر تقسیم کرتے۔"نذرِ مولا، نیازِ حسین" کے نعرے لگاتے، امام بارگاہوں میں داخل ہو جایا کرتے۔ مجلس کے وقفے میں زبردستی چاول اور کھیر کھا کر یوں سینہ تانے، امام بارگاہوں سے نکلتے جیسے جنت کما آئے ہوں۔ بازاروں میں ٹھنڈے سرخ شربت راہ گیروں میں بانٹتے۔ جگہ جگہ سبیلیں لگواتے۔ سینما ہال بھی بند ہو جایا کرتے۔ لوگ اُس بازار میں جانا چھوڑ دیتے: ایک محرم میں، دوسرا رمضان میں۔ پورا شہر روحانیت میں ڈوب جایا کرتا۔ مری آباد کی امام بارگاہ سے وہ موم بتیاں اور اگربتیاں جلاتے ہوئے شہر کی جانب بڑھتے۔ گھوڑے کو ایک ایک امام بارگاہ کا محل وقوع یاد تھا۔ اتنا علم کسی سنی تو کیا کسی راسخ العقیدہ شیعہ کے پاس بھی نہ ہوتا۔ تین راتیں محلے محلے امام بارگاہوں میں اگربتیاں جلاتے پھرتے، شمع روشن کرتے، دعائیں مانگتے رہتے۔ علَموں کی زیارت کرتے۔ یہ سلسلہ نویں محرم پر منتج ہوتا۔

بابو اب ان کے ساتھ امام بارگاہوں میں جانے لگا تھا مگر تھا بڑا سود خور۔ زمبیا سے ضمانت چاہتا تھا کہ اس کا کام ہو جائے گا۔ زمبیا نے ٹکا سا جواب دیا کہ یہ تو دعا کی سچائی پر منحصر ہے۔ دوستوں کا ساتھ ضروری تھا۔ لہٰذا بابو بھی ساتھ جانے لگا۔ بڑا سا بنڈل اگربتیوں اور موم بتیوں کا باندھ کر ساتھ ہو لیا کرتا۔ مرادیں مانگنے کے لیے علَم کو گرہ لگاتے تو بابو بھی گرہیں لگانے لگتا۔ وہ دو دو اگربتیاں اور دو دو موم بتیاں جلا لیا کرتا۔ استفسار پر بتاتا کہ ایک اس کی جانب سے ہوا کرتی ہے، ایک نسیم کی جانب سے۔

چھوٹے چھوٹے ماتمی دستے گلیوں میں منت کے علم لیے جاتے تو سنی حضرات سبیلیں لگا لیتے، کھیر بانٹنے اور التجائیں کر کے ماتمی دستوں کو شربت پینے کے لیے روکتے۔ بابو بھی ان اقدامات میں پیش پیش رہتا۔ خالو کو بھی تسلی ہو گئی کہ امام بارگاہوں میں جاتا ہے، نسیم کو بھول گیا ہے۔ اگر شیعہ ہو جائے بابو تو اور بھی اچھا ہو گا۔ پھر تو جواز بھی ہو گا کہ نسیم سنی لڑکی ہے، لطیف وغیرہ تو سخت اعتراض کریں گے۔ مجلس سن کر ہو سکتا ہے کہ بابو کے دل کا یزید مر جائے۔

ایک روز اچانک بابو غائب ہو گیا۔

زمبیا ان کے گروپ کا واحد مولائی تھا۔ محرم کے دنوں میں بابو اس کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ بڑی ڈھنڈیا پڑی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ بابو نے خودکشی کر لی ہے۔ بابو کو سبھی پہاڑوں میں ڈھونڈتے پھرتے، مگر چہل تن کی طرح سراغ نہ ملا۔ پولیس کو خبر دی گئی۔ یوسف اتنا جذباتی ہوا کہ اس نے تھانے میں واویلا مچایا کہ ہنہ جھیل خالی کی جائے، تہہ سے بابو برآمد ہو گا۔ تھانے دار پہلے تو سمجھاتا بجھاتا رہا۔ آخر بے زار ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے، تم لوگ بالٹیاں لے آؤ اور پانی نکالنا شروع کر دو۔ حوالدار، ان جوانوں کو بالٹیاں دے کر روانہ کر دو۔“

”ہمارا دوست غائب ہے۔ آپ بھی تعاون نہیں کر رہے۔“ انور نے احتجاج کیا۔

تھانے دار بے زار بیٹھا تھا۔ ”یہ جو ہنر و کا ماں تم ساتھ لائے ہو، اس کو تو چپ کراؤ۔ مہربان ٹانگے والے کی طرح بولے چلا جا رہا ہے۔“ اشارہ یوسف کی جانب تھا۔

”یہ بچہ ہے۔“ گھوڑے نے یوسف کے قد و قامت کا فائدہ اٹھایا۔

تھانے دار غضب ناک نگاہوں سے یوسف کو گھورنے لگا۔ تھانے دار بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ ”بچہ کہاں، یہ تو میرا باپ ہے۔ اس کے پیٹ میں داڑھی ہے۔ اسے سایہ ہو گیا ہے، یا سوکھے پن کی بیماری ہے۔ ہو سکتا ہے اسی نے بابو کو قتل کیا ہو۔ اس کا ریمانڈ لینا چاہیے۔ تم رپورٹ لکھواؤ۔“

یہ سن کر ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دوستوں نے فوراً تھانے سے فرار ہونے [illegible] ہی مصلحت دیکھی۔

[illegible] ی شام ایک حوصلہ افزا خبر ملی کہ پنجگور کے علاقے میں بابو کو دیکھا گیا ہے کہ وہ تربت کی

بس میں جگہ نہ ملنے کے سبب بس کی چھت پر بیٹھا تھا۔ بھی کی ڈھارس بندھی کہ زندہ سلامت تو ہے مگر تربت سے کیا علاقہ۔ ممکن ہے کہ ڈگری بن گیا ہو اور کوہِ مراد کے طواف کر رہا ہو کہ اسے نسیم مل جائے۔ زمبیا کو سخت غصہ آیا۔ ''اہلِ بیت سے مانگتا۔ ان سے مودت اختیار کرتا۔ یہ کہاں تربت کے صحراؤں میں چلا گیا۔ شاید دیوانہ ہو گیا ہے۔''

اگلے ہفتے بابو لوٹ آیا مگر پہچانا نہ جا سکا۔ دھوپ سے رنگ جل چکا تھا۔ گرم صحرائی ہواؤں نے حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اُن دنوں کوئٹہ سے بس تین دن میں تربت پہنچا کرتی تھی۔ بابو نے بس کی چھت پہ یہ فاصلہ طے کیا اور سسی پنوں کے قلعہ میں پہنچا۔ روایت ہے کہ سسئی کے مزار پر مانگی جانے والی عشاق کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ آنٹی سسی پتا نہیں کس اونٹ پر کیسے وہاں پہنچی ہو گی۔ وہ بھی اُس زمانے میں شاید بی ایم ڈبلیو کار کی طرح ہوتے ہوں گے۔ اُس زمانے میں 2300 سی سی ٹربو اونٹ، انٹر کولر اونٹ۔

یہاں سے وہ موڑ شروع ہوا کہ لوگ بابو کے عشق سے بے زار ہو گئے۔ دوست سال میں دو تین کامیاب عشق کیا کرتے اور بابو کئی برس سے ایک ہی نام کام عشق کے سہارے گھسیٹتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے عشق میں جنگل باغ کے ٹھہرے ہوئے پانی کا سکوت آ چکا تھا۔ خالو تو کیا نسیم کے بھائی بھی لاتعلق ہو چکے تھے۔

اس عشق نے بابو کو غرق ترک کر دیا۔ بابو بہت ہی Obsessed ہو گیا تھا۔

''یہ عشق نہیں ذہنی بیماری ہے، مالیخولیا ہے۔'' انور نے آخری اعلانِ بے زاری کیا۔

انور پڑھائی میں بہت محنت کر رہا تھا۔ اس کے اپنے ٹارگٹ تھے۔ امتحان کے دنوں میں رات کے دو بجے نیند بھگانے کے لیے سڑک پر آ گیا کہ سردی سے ذرا ذہن تازہ ہو۔ دیکھا کہ ایک بلا تیس فٹ لمبا بانس لیے کھڑی ہے۔ وہ کانپ کے رہ گیا کہ مم ہے یا از قسم جنات۔ لرزہ طاری ہو گیا۔ مگر سوچا کہ مم تو جوانوں کو پہاڑوں میں لے جاتی ہے، پھل کھلاتی ہے، اپنا شوہر بنا کے رکھتی ہے۔ اگر واقعتاً مم ہے تو مجھ جیسے ہیرو کو ضرور لے جائے گی۔ اچھا ہے کہ پڑھنے سے جان چھوٹ جائے گی۔

لرزتے قدموں سے درود شریف پڑھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

دیکھا تو باہر بابو کھڑا ہے۔ ہاتھ میں تیس فٹ لمبا بانس ہے۔ جس کے اوپر روس کا نشان درانتی بندھی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا عاشق زار رات کو درِ محبوبہ پر جاتا ہے۔ بجلی کے کھمبے کے بلب یہی توڑتا رہتا ہے۔ کوئٹہ میونسپلٹی تبھی تو نقصان میں جا رہی تھی۔ ان کے علاقے کا کونسلر بھی بلب لگوا لگوا کر باولا ہوا جاتا۔ اوپر تاروں میں غالباً 440 والٹ کا کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ خدانخواستہ بابو درانتی کو تاروں میں پھنسا کے کنکشن توڑتا تو بجلی کی تاریں اس پر آ گرتیں۔ جس سے بابو لال کباب کا نمکین روسٹ بن جاتا۔

اس نے گھنٹہ بھر لگا کر بانس سے بانس جوڑ کر، یہ جناتی بانس تخلیق کیا تھا۔ درانتی جانے سکھوں کے زمانے کی کہاں سے لے آیا۔ شکر ہے کہ بابو بچ گیا ورنہ تو انور کے باقی پرچے خراب ہو جاتے۔ ظاہر ہے اسے فاتحہ پر تو بیٹھنا ہی پڑتا۔

انور نے اپنے کمرے سے اعشاریہ دو دو کی بندوق نکالی۔ اس پر اچھی طرح تولیے لپیٹے کہ آواز نہ ہو اور بلب اُڑا دیا۔ سڑک اندھیرے میں ڈوب گئی۔ رفع شر کے لیے انور نے بابو سے کہہ دیا کہ جب بھی ضرورت ہو اسے کہہ دیا کرے، وہ بلب توڑ دیا کرے گا۔

بابو شکر گزار ہوا مگر عشق کی آگ میں تپ رہا تھا۔ چیتے کی چال چلتا نسیم کی دہلیز پر پہنچا۔ وہ بھی اب اسے اندر بلانے لگی تھی۔ وہ منہ اندھیرے جوتی ہاتھ میں پکڑے، اپنے گھر لوٹتا، چپکے سے بیرونی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر پہنچ جاتا۔ بارہ بجے اُٹھ کر ناشتہ کرتا اور کاپی پکڑ کر کالج کا رخ کرتا۔

ایسی ہی ایک رات میں لطیف نے حفاظت کے پیشِ نظر گھر کے گیٹ کو اندر سے تالا لگا دیا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ زور کی برف باری ہوئی۔ بابو جو شبِ وصال کے بعد آئینہ دیکھے بغیر تو دروازہ مقفل پایا۔ فرار کے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ بوٹ جیب میں ڈال، جیسے تیسے چھت پر چڑھا اور دَم سادھے لیٹ گیا۔ ٹین کی چھت رات بھر کی برف باری سے سخت سرد ہو چکی تھی۔ کھسکتا ہوا مخالف سمت بڑھا، چوں کہ چھت ڈھلوان تھی، اگر پھسلتا تو دوبارہ نسیم کے صحن میں آ گرتا۔ جہاں بلوچستان چیمپئین شفو سواگت کے لیے ملتا اور لطیف بھی بھرتہ بنا دیتا۔ کھسکتا کھسکتا کوئی نصف گھنٹے میں پڑوسی کی چھت پر جا پہنچا۔ طارق فجر کی تیاری کر رہا تھا۔ چھت پر کھٹ پٹ کی آوازیں سنیں تو سمجھا کہ چور ہے۔ جھٹ پستول نکال، سیڑھی چڑھا تو بابو کو ہانپتے کانپتے پایا۔

سردی سے کپکپی طاری تھی۔ یخ بستہ لہجے میں فریاد کی: "میں بابو ہوں، گولی مت چلانا۔"
پڑوسی طارق جو بابو کے عشق سے واقف تھا، اندر لے آیا۔ بابو کے کانپتے ہاتھوں میں چائے تھمائی اور بہت سا کوئلہ ڈال کر سٹوو جلایا۔ ورنہ شاید بابو محبت کی بجائے نمونیہ سے ہلاک ہو جاتا۔
اس سانحہ کی بڑی دھوم ہوئی۔ کیا مرد، کیا خواتین سبھی کو بابو سے بہت ہمدردی ہوگئی۔ کئی سرپھروں نے بابو کو اپنی مدد کا یقین دلایا۔ بابو اس برفانی رات میں ہیرو بن گیا۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے، اس جوان کے سینے میں دو سیر کا دل ہے۔ جتنا عاشق تو بدمعاش کا تھا۔

انور شام کو لوٹ رہا تھا کہ جانے کہاں درختوں سے خالو نکل آیا۔ سلام دعا کے بعد وہ ساتھ چلنے لگا۔

"بیٹا میرا ایک کام کر دو گے؟"

"آپ حکم کرو خالو۔۔۔۔کیا کام ہے۔"

"بابو کے دل سے نسیم کی محبت نکال دو۔"

"خالو کمال کرتے ہیں آپ بھی، کبھی محبت بھی دل سے نکلی ہے۔"

"بیٹا! میں تمھیں معقول رقم دوں گا۔ مجھے پتہ ہے تم لوفر، لفنگے قسم کے انسان ہو۔ ہر بری عادت تم میں ہے۔ ایسے نوجوانوں کو تو روپے کی ہمیشہ ضرورت ہوا کرتی ہے۔"

انور کے دلِ سوختہ سے ایک آہِ سرد نکلی، جس سے کوئٹہ میں مزید سردی ہو گئی۔ "سچ بولتے ہو خالو، آج کل لنگ ولاش ہوں، ٹکر ٹکر پھرتا ہوں۔ خالو، میرے خالو کچھ دو، دعا دوں گا۔ غریب ہوں خالو۔"

خالو کی جبین ناز پر شکن پڑ گئی۔ "اپنی دعائیں اپنے پاس رکھیے برخوردار، بابو کے دل سے نسیم کو نکال دو اور روپیہ بھی دوں گا۔"

"خالو مجھے کیوں منتخب کیا۔ بابو کے اور بھی تو دوست ہیں۔"

"جانے دو بیٹا۔۔۔یوں ہی۔"

انور کا ماتھا ٹھنکا "سچ بولو خالو۔۔۔زیادہ شف شف مت کرو۔"

"بیٹا۔۔۔اس کے دوستوں میں تم سب سے کمینے، احسان فراموش سے لگتے ہو۔ بابو کا زیادہ مال تم نے کھایا ہے۔ زیادہ بگاڑا بھی تم نے ہی۔ تم سے بہتر کون بابو کو بدراہ کرے گا۔ میرا کام کردو بیٹا۔"

"خالو! بے فکر ہو جاؤ، بیماری پرانا ہے۔ شوٹ شوٹ نہیں جائے گا، مگر بابو خوامخواہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

انور کو بہت دنوں بعد روپیہ ملا تو کو ئٹہ حسین حسین دکھائی دینے لگا۔ بابو جو نعرہ لگایا کرتا: "مولا، بھیج سونے کی توپ، چاندی کا گولا"، اسی کا اثر تھا کہ خالو نے بیٹے کا نان ونفقہ بند کر رکھا تھا۔ مولا نے چاندی کا گولا انور کے لیے بھجوا دیا۔ انور کو حسینائیں بھی مل رہی تھیں۔ روپیہ بھی قسمت کا دیوتا دے رہا تھا۔

بابو پاورٹی لیول سے نیچے زندگی گزار رہا تھا۔ تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ گھوڑے کے ہمراہ لڑکوں کا ڈانس دیکھنے سرکی روڈ کے چونے کے بھٹے والے علاقے میں گیا ہے۔ جو بی ایریا ہے، جہاں پولیس نہیں جا سکتی۔ انور جانتا تھا کہ وہاں بدمعاش کھڑے رہتے ہیں۔ ایسی محفلیں فار ممبرز اونلی ہوا کرتی ہیں مگر وہ بدمعاش کی زبان سے بہ خوبی واقف تھا۔ لہٰذا کوئی دِقت پیش نہ آئی۔ وہ سمجھے اپنا ہی کوئی ساتھی ہے۔ لباس بھی ویسا ہی تھا۔ سر پر ٹیڑھی قراقلی جو دادا گیری کی علامت تھی۔ ایک پائنچہ ذرا سا اوپر، شلوار کی الٹی سلوٹیں۔ نیفے میں چاقو رکھنے کی وجہ سے دائیں جانب کا پائنچہ خود بخود اٹھا جایا کرتا تھا۔ اور کندھے جھٹک جھٹک کر چلنا، ممبر شپ کارڈ کے طور پر ہاتھ میں چرس کا سگریٹ۔ وہ سب تو باقاعدہ چرس نہیں پیتے تھے، مگر ایسی محفلوں کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے دھڑا دھڑ چرس کے سگریٹ پیا کرتے تھے۔ ایسے سگریٹوں کو پیتے ہوئے سگریٹ کا رخ امریکی راکٹ کی طرح آسمان کی طرف کرنا پڑتا تھا۔ ماش (چرس) کے بھرے سگریٹوں کو انگشت شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے پکڑا جاتا تھا۔

شہنائی، ڈھول اور ہارمونیم کی تال پر رقص جاری تھا۔ ٹھا کر اپنے دلربا لے کے آئے

ہوئے تھے۔ کندھوں تک کٹے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ رقص کے مخصوص لباس میں ناچتے تو فراک کے گھیرے کنول کی طرح پھیل جاتے۔ پرائیویٹ اور نمبر پلیٹ والے لڑکوں کے بعد جو چاہنے والوں کو ذاتی ملکیت شمار ہوا کرتے۔ پیشہ ور لڑکوں کا ڈانس شروع ہوا۔ انھوں نے نہایت سستی لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ پانچ روپے کی بیل دینے والوں کا ایک بوسہ بھی لے لیتے۔ انور نے گھوڑے کے سر پر بھی پانچ پانچ کو نوٹ رکھے۔ جس سے گھوڑے کا چہرہ جگہ جگہ سے سرخ ہو گیا۔

"بینک لوٹا ہے کیا؟" بابو نے استفسار کیا۔

انور نے بقایا رقم بابو کی جیب میں ٹھونس دی۔ "شکر خور کو شکر، موذی کو ٹکر۔ شوم کا مال غازی کھاتا ہے۔ زور ئے عیش کرو۔ لگے دم، مٹے غم، جارسم!! تمھارا تو دین بھی غرق ہے۔ دنیا بھی، بس ابھی تم ماش کے سگریٹیں پیو اور غم بھول جاؤ، یا تم اشرف کا طرح بچہ خوش بن جاؤ۔ نہ پریشانی، نہ جدائی۔ سارا وقت ساتھ رکھو۔ مسافر اپنے سامان کا خود ذمے دار ہے۔"

"روپیہ کدھر سے آیا۔ یار سیدھی بات کرو۔" بابو جھلا گیا۔

"بابو یہ پیسہ تمھارا باپ کا جیب سے نکالا ہے۔ تم تو لنگ ولاش ہے۔ روپیہ خواہ مخواہ تم مانگتا ہے۔"

"واہ مولا۔" بابو جھوم اٹھا۔ "بھیج سونے کی توپ، چاندی کا گولہ۔ اچھا ہے ہمارا طبیعت بھی بند تھا۔ زرنیست عشق ٹیں ٹیں۔"

"بابو تم ایک پانچ روپیہ گھوڑے پر بھی تاوان کرنا۔ ڈرائی کلین کا قابل ہو گیا ہے، دھلائی سے یہ سرخ سرخ نشان نہیں جائے گا۔"

یہ رقم بابو کے لیے امریکی امداد ثابت ہوئی۔ پرانا قرضہ اتارے تاکہ نیا قرض مل سکے۔ خالو اب باپ کی بجائے رقیب کا کردار ادا کر رہا تھا۔ نسیم سے وہ obsessed ہو چکا تھا۔ سحر بھی گزرتی تو آپے سے باہر ہو جاتا۔

اس طوفانی عشق میں بابو پلندے لکھا کرتا۔ گھنٹوں انتظار کرتا رہتا کہ کب نسیم سحر دروازے پر آئے گی۔ چوڑی گلی جائے گی، کالج جائے گی۔ اس کا سارا سارا دن اسی میں گزر جاتا۔ وہ فل ٹائم

عاشق تھا جب کہ نسیم پارٹ ٹائم عشق فرماتی۔ یہ ایک ہابی تھی اس کی، ورنہ اس کی زندگی متوازن تھی۔ باقاعدگی سے پڑھ رہی تھی۔

نسیم نے بی اے کر لیا۔ اسے انگلش ٹیچر کی جاب مل گئی۔ بابو کی کوششوں سے گھر کے ساتھ ہی گرلز ہائی اسکول میں تعیناتی ہو گئی۔ اب بابو دھڑا دھڑ شربت دیدار پینے لگا۔ نسیم بھی جام لنڈھانے لگی تھی۔ چوں کہ وہ ہائی اسکول ٹیچر تھی، کسی بھی وقت گیٹ پر آ سکتی تھی۔

صدر دروازے کے ساتھ ہی دائیں بائیں کرائے کی دکانیں تھیں۔ یہ ہائی اسکول بھی میونسپلٹی کا تھا اور کرائے کی دکانیں بھی۔ گیٹ سے متصل دائیں جانب باری دھوبی کی دکان تھی اور بائیں جانب سبزی کی۔ سبزی کی دکان میں تو سکوپ نہ تھا، البتہ دھوبی کی دکان میں بابو فٹ ہو گیا۔ باری ایک ناکام دھوبی تھا۔ چالیس برس کا رہا ہوگا۔ اس کا تعلق بھی "لے کے رہیں گے پاکستان" والے قبیلے سے تھا۔ بابا نے ہجرت کی، کوئٹہ آ کر مکمل آزادی حاصل کر لی۔ یہاں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ عدالتیں انصاف کرتی ہیں۔ ملازمت کے یکساں مواقع ہیں اور اسلام کا بول بالا ہے۔ بابا چل بسے تو باری نے آبائی دکان بیچ ڈالی، کیوں کہ پلازہ بن رہا تھا۔ اچھی قیمت مل گئی۔ مزاج دھوبیانہ تھا اور عاشقانہ بھی، گرلز ہائی اسکول سے متصل دکان کرائے پر حاصل کی، یوں دنیا بھی سنور گئی، دین بھی۔

بابو سے یارانہ بھی اس نے خود ہی گانٹھا۔

"بابو بھائی بیٹھو۔ ابھی ہمارا ساتھ ہانڈی والی کرو۔ نسیم کے لیے تم خواہ مخواہ ادھر آئے گا۔ ہمارا دکان پر بیٹھو، دست لانی سے پہلے آ جایا کرو، وختی وختی آیا کرو، تمھارا دکان ہے۔"

دیدار کی طلب میں بابو صبح سویرے باری کی دکان پر بیٹھ جایا کرتا۔ بلکہ حالت یہاں تک پہنچی کہ باری تو انگڑائیاں لیتا دس بجے دکان پر آتا اور بابو صبح سویرے دکان کھول کر دعائیں مانگتا رہتا: الٰہی غنچۂ امید بہ کشا۔"

گھوڑے کو صورت حال کا علم ہوا، سوٹے مارتا ہوٹل میں داخل ہوا۔ بابو پر برس پڑا۔

"عاشق نامراد، اماں کبھی تو تجھے عشق میں کوئی نہ تو دھوبی بنا تھا، نہ ہی نائی۔"

زمبیا کی محبوبہ نے ملنے کا وعدہ کیا تھا، حیران تھا کہاں لے جایا جائے۔ زمبیا گزشتہ رات بارہ بجے گورنر ہاؤس کے سامنے لیٹ گیا اور یہ گیت، وہ کورس کی شکل میں گاتے رہے۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا

رہنے کو گھر نہیں ہے، سارا جہاں ہمارا

اس الم ناک صورت حال پر بھی دوست دردناک گیت سن رہے تھے، چائے کا دور چل رہا تھا۔ اس عالم مفلسی میں بھی بابو دوستوں پر لٹایا کرتا۔

''زوئے! تم یہ کیا پاٹیں کرتا ہے۔ ابھی دھوبی گیری شروع کیا، یہ کیسا عشق ہے۔ دھوبی گیری سے تم کیا بلا مانگتا ہے۔ باری خر آسرے باز ہے۔ ابھی تم کو دکان کا آموختہ کرتا ہے۔ پھر تم کو دھوبی بنا دے گا۔''

بابو نے اس گرج چمک کے ساتھ چھینٹے پڑنے پر توجہ نہ دی۔ گھوڑے کا لب ولہجہ شیریں تھا۔ گالیاں بکتا بھی تو لگتا کہ لوریاں دے رہا ہے۔ اس کی آواز بھی زنانہ انداز کی سُریلی تھی۔ ''استاد ہمارا اوپر کوئی پٹو نہیں ڈال سکتا۔ لوگوں نے تو عشق میں سر کٹائے ہیں۔ عاقل خان کی طرح گرم پانی کی دیگ میں زندہ ابل گئے۔ بے غم ہو جاؤ۔ ہم اگر دھوبی بن گیا کیا ہوئے گا!''

گھوڑے نے نہایت خلوص سے پنجہ کھول کر بابو کے منہ پر رکھ دیا۔ ''پھٹ تمھارا اوپر، تم خرتاوانی ہے۔''

پھر گھوڑے نے چائے کا آرڈر دیا اور فلاش کی باتیں کرنے لگا۔ قدرت اسے خوب کلر راونڈ دے رہی تھی۔ لنگوی بھی مل جایا کرتی۔

خالو کو جلدی ہی پتہ چل گیا کہ ولی عہد سلطنت نسیم کے لیے دھوبی کی دکان پر بیٹھنے لگے ہیں، بلکہ اپرنٹس شپ شروع کر دی ہے تو سر پیٹ لیا۔ ماں نے اپنا سینہ کوٹ ڈالا۔ بابو نے ٹالنا چاہا مگر خالو لٹھ لے کے پیچھے پڑ گیا۔ خالو طرح دیتا رہا تھا مگر اب وہ برداشت نہیں کر رہا تھا یہ چھن۔ نہرو کی ماں اٹھتے بیٹھتے وہ، بابو کو زبان سے چرکے لگاتی رہتی۔ بابو بھی اسی کا بیٹا تھا، آخر اس پر کوئی اثر نہ ہوا، اس کا اسکریچ پروف عشق تھا۔

انور سے بازار میں مڈ بھیڑ ہوئی تو خالو راستہ روک کے کھڑا ہو گیا اور بابو کو بے نقط سنانے لگا۔ انور سٹپٹا گیا۔ کرے داڑھی والا، پکڑا جائے مونچھوں والا۔ انور کی تو مونچھیں بھی نہیں تھیں۔

"خالو! تم ایک دفعہ حوصلہ پکڑو، بولڈ آلی کرو۔ ایسا چینٹیں لگاؤ، ایسا کتاس لگاؤ کہ بابو صحیح ہو جائے۔"

خالو بہت دکھی تھا۔ "بیٹا وہ ایم اے کرلے تو گھر سے نکال باہر کروں گا۔ کم بخت عشق میں دھوبی بن گیا ہے۔"

انور کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اگر خالو کو علم ہوا کہ بابو تھرڈ ڈویژن میٹرک پاس ہے تو کیا کرے گا۔

خالو کے صبر کے بندھن ٹوٹ گئے، وہ پھٹ پڑا۔ "میں نے بابو سے کہا، تم کمینے ہو، ذلیل ہو۔" مہذب گالیوں کا طوفان آ گیا۔ جیسے ہنہ جھیل کا بند ٹوٹ چکا ہو۔

انور کے والد کے ایک دوست عزیز بھوپالی گزر رہے تھے، جو یہ منظر دیکھا تو دوڑے چلے آئے۔ لیاقت بازار پر ہجوم تھا۔ کچھ اور راہ گیر بھی متوجہ ہو گئے۔ چند ایک تو رک ہی گئے۔

"آپ اس لڑکے کو کیوں ڈانٹ رہے ہیں آخر" عزیز بھوپالی بھوپال کے انداز میں ڈپٹ کے بولے۔

"انکل! یہ سارے Adjectives اپنے بیٹے بابو کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ میرے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔"

عزیزی بھوپالی بہت ناخوش ہوئے۔ "اپنے بیٹے کو گھر میں سنائیے۔ یہاں تو لگتا ہے میرے بھتیجے کو ڈانٹ رہے ہیں۔ جاؤ بیٹا گھر جاؤ۔"

خالو کا جی نہ ٹھنڈا ہوا۔ رات میں انور کے والد کے پاس شکایت لے کے چلا آیا۔ جانے کیا کچھ کہا کہ انھوں نے انور کو بلا بھیجا۔

"تم اپنے دوست بابو کو سمجھاؤ کہ نسیم کا پیچھا چھوڑ دے۔"

"آپ خالو سے کہیے کہ نسیم کی شادی بابو سے کر دے۔"

"خالو ناحق نہیں ہے۔ بابو لچری کرتا ہے۔ اپنے باپ کا بکری گم کیا ہے۔ یہ سفید ریش ہے۔ اس کا خیال کرے، نسیم سے کیا بلا مانگتا ہے۔"

انور بابو کے لیے تکرار کر رہا تھا۔ دلیلیں انور کی بھی مضبوط اور منطقی تھیں۔ والد محترم حیران ہو رہے تھے کہ کس کا ساتھ دیں۔ وہ بابو کے دھانسو عشق سے واقف تھے بلکہ بابو تو ایک لیجنڈ بن چکا تھا۔ ان کے علاقے کے لوگ تو خوش تھے۔ حانی وشہ مرید، مستیں تو کلی وسمو کے بعد بابو، نسیم کا عشق ہو رہا ہے۔ اتنا بڑا گریڈ بائیس کا خاندانی عاشق اُن کے علاقے میں پیدا ہوا، یہ ایک قابل رشک اعزاز تھا۔

باری، بدمعاشوں کے اڈوں پر بھی جوا کھیلنے جایا کرتا تھا۔ ایک پیشہ ور بدمعاش سے شارپنگ کی وجہ سے لڑائی ہوگئی۔ باری نے بابو کو بتایا۔ چند روز بعد وہی بدمعاش دکان کے سامنے سے دندناتا ہوا گزرا تو باری نے محض بابو کی شہ پر اس بدمعاش پر حملہ کر دیا۔ باری کم زور پڑا تو حق دوستی ادا کرنے کے لیے بابو میدان میں کود پڑا۔ باری خاندانی دھوبی تھا؛ دھوبی ابن دھوبی۔ جب کہ بابو عاشق زار تھا۔ آہیں بھرتا اور عشقیہ خطوط لکھے جاتا تھا۔ لڑنے بھڑنے کا تجربہ نہ تھا۔ بدمعاش نے دونوں گھونسوں پر رکھ لیا۔ ان کی قسمت اچھی کہ صدیق کا گزر ہوا۔ اس نے بدمعاش کی خوب پٹائی کی۔ بدمعاش گالیاں دیتا، خون تھوکتا گیا۔ دھمکیاں بھی دیتا چلا گیا۔

"ولا جو تم کو چھوڑے باری۔ تمھارا ہم تختہ کرے گا۔"

باری نے آنکھیں دکھائیں۔ "زوئے پٹکہ مت مارو۔ خر بکری، بگیل ہوگیا۔ جو کاٹنا ہے ابھی کاٹو۔"

تھوڑے ہی دن گزرنے تھے کہ بدمعاش نے موقع پا کر باری کے بڑے بھائی کو قتل کر دیا۔ وہ شریف سا انسان تھا۔ شومئی تقدیر سے رات کے وقت باری کے کپڑے پہنے جا رہا تھا کہ بدمعاش نے باری سمجھ کر چاقو گھونپ دیا۔ دوستوں میں سخت سنسنی پھیل گئی۔ کیوں کہ بدمعاش نے انڈر گراؤنڈ ہونے سے پہلے پیغام بھجوایا کہ اگلی باری بابو اور صدیق کی ہے۔ صدیق کی تو انھیں پروانہ تھی، وہ حیدرآباد کر سپر ہائی وے پر بھی قتل کر چکا تھا جو ثابت نہ ہو سکا۔ البتہ بابو کی پریشانی تھی۔ کیوں

کہ شریف انسان کو مارنا بہت ہی آسان ہوا کرتا ہے۔ شریف انسان اپنی شرافت کے پنجرے میں بند گیلے چوہے کی طرح ہوتا ہے۔

عالم پریشانی میں دوست بابو کو سنڈیمن لائبریری کے پارک میں لے گئے۔ فضا خاموش تھی۔ سکون سے گفتگو ہو سکتی تھی۔ سہ پہر خنک تھی۔ جناح روڈ پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ شاخسانہ نسیم سے شروع ہوا تھا۔ نہ نسیم ہوتی، نہ باری کو لفٹ کرائی جاتی، نہ قتل ہوتا، نہ ہی بابو کو قتل کی دھمکی ملتی۔

بابو کو درمیان میں بٹھا کر سارے دوست ایک نیم دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ باری باری دوست بولتے چلے گئے کہ بابو نے نسیم کے عشق میں زندگی تباہ کر دی ہے۔ نسیم کے لیے بابو باؤلا ہو گیا ہے، دیوانہ جنونی ہو گیا ہے، عشق کیا یہ تو ذہنی مرض ہے۔ عشق تو وہ سبھی دوست کیا کرتے۔ بابو ایک ہی عشق میں پھنس کے رہ گیا۔ یہاں یار لوگ نصف درجن عشق کیے بیٹھے تھے اور مزید عشق کرنے کا ارادہ تھا۔ بابو نہایت سکون سے بلاٹو کے اعتراضات سنتا، سگریٹ پھونکتا رہا۔

سمجھا بجھا کے جب سبھی تھک کر خاموش ہو گئے تو بابو نے اعلان کیا۔ ”زوئے! ہم کو ملنا ہے تو ملو نہیں تو جہنم میں جاؤ، ہم تم سب کو چھوڑ سکتا ہے، نسیم کو مر کے بھی نہیں چھوڑے گا۔ خرجنجالی۔“

”بابو زیادہ ہڑادھوڑی مت کرو۔ ہمارا بغیر تم ٹکر ٹکر ہو جائے گا۔“ زمبیا نے تنبیہ کی۔

گھوڑے کے لہجے میں بڑی مٹھاس تھی۔ رس گھولتی آواز میں بولا ”اتنا لچری مت کرو۔ پھر اہمار درک نہیں ہوئے گا۔“

”ہم وارا کھا سکتا ہے۔“ بابو تنک کے بیٹھا تھا۔

”ناژوانی مت کرو بابو۔ لڑکی کو دوست پر ترجیح دیتا ہے۔“

”وہ ہمارا سب کچھ ہے۔ بجائے تم لوگ ہم کو چھوڑے، میں خود شاٹ ہو جائے گا۔ بیجنی بے وفا دوست ہے تم سارا، خر بے وفا، بے وفا دوست سے تو سگریٹ اچھا ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے، بابو ٹیڑھا میڑھا چلتا نکل گیا۔ دوست سکتے میں رہ گئے۔ انھیں امید نہ تھی کہ بابو یوں بے وفائی کرے گا۔ وہ بھی ایک لڑکی کے لیے۔ لڑکی ان کی نظر میں قربانی کے دنبے سے زیادہ اہم نہ تھی۔ وہ تو ڈکشنری ریشمی غلاف میں لپیٹ لپیٹ کر لے جایا کرتے اور

ڈکشنری پر ہاتھ رکھ کر خوباں سے وفا کا عہد کیا کرتے: "اس مقدس کتاب کی قسم ہے کبھی بے وفائی نہ کروں گا،تم سے شادی کروں گا۔"

کچھ دن بعد دوستوں کو احساس ہوا کہ محفلوں کا روحِ رواں تو تھا ہی بابو۔ جو سب کو اکٹھا کرتا، ساتھ لیے پھرتا۔ ان کے پسینے کی جگہ خون بہانے کے لیے تیار رہتا۔ سوچ رہے تھے کہ میڑھ کر کے بابو کو منالائیں۔ کیوں کہ اس نے ہوٹلوں میں بھی آنا جانا ترک کر دیا تھا کہ لوگ سوال کریں گے کہ دوست کہاں ہیں۔ وضع دار اتنا کہ چاہتا تھا دوستوں کی بات لوگوں تک نہ پہنچے۔

بابو نے اپنی سادگی میں کسی کی ضمانت دی تھی۔ وہ قرض دار تو بھاگ نکلا، قرض خواہ نے بابو پر دباؤ ڈالا کہ ضامن ہونے کے ناتے اپنا فرض پورا کرے۔ بابو کو انکار تو نہ تھا مگر تھا وہ تہی دست۔ اس شخص کے تھانے میں کچھ روابط تھے۔ اس نے سپاہی بھجوا دیے۔ بابو تھا نہیں۔ یوسف نے دیکھا کہ بابو کو پکڑنا چاہتے ہیں تو ضمانتاً اپنے آپ کو پیش کر دیا۔

"میں بابو ہوں۔ چلو زوئے کدھر چلنا ہے۔"

وہ اسے تھانے لے آئے۔ اتنے میں بابو کو خبر ہوئی تو وہ دوڑا چلا آیا۔ یوسف کہے میں بابو ہوں جب کہ بابو اصرار کرے کہ وہ بابو ہے۔ تھانے دار چکرا گیا "پتر! اصلی تے ڈوا بابو کون ہے؟"

خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ دوست دوڑے چلے آئے اور بابو کو بچا لائے۔ دوستوں نے بابو کے عشق سے زچ ہو کر پناہ مانگ لی، نسیم پر تنقید سے۔

"یہ مرض پرانا ہے، جان لیوا ہے۔"

"بابو کا عشق خرناٹ ہے۔"

"اب بابو نہیں سنبھلے گا۔"

بس جتنے منہ اتنی باتیں بابو کو چہ مگوئیوں کی پرواہی کب تھی۔ خطوط نویسی میں زیادہ بہاؤ آ گیا۔ تواتر سے خط لکھتا۔ خطوط بھی ایسے جذباتی، جن کی لو سے پتھر بھی پگھل جاتے۔

بابو کو عشق کا ایسا عجیب نشہ چڑھا تھا کہ خالو کے لہجے کی ترشی بھی نشہ نہ اتار سکی۔ نہ وہ دوستوں کی ناراضی کی خاطر میں لایا۔ گھوڑے نے پہلے ہتھیار ڈال دیے۔ خود ہی ہنہناتا ہوا بابو کے پاس آ

گیا۔"یاری میں بڑے کا گوشت کھانا پڑا ہے۔تم ہمارا جٹ ہے، ہم تمھارے ساتھ بھنڈار کرے گا۔"

بابو بہت خوش ہوا۔فوراً گھوڑے کے ہاتھ سے قیمتی سگریٹ کھینچ کر پینے لگا۔ بہت دنوں بعد قیمتی سگریٹ ملا تھا۔

گھوڑے نے اب بابو کا ساتھ دینے کا عہد کرلیا۔نسیم چوں کہ ٹیچر تھی، قدرے خودمختار تھی۔ کہیں آنے جانے پر وہ پہلے والی پابندی نہ تھی۔گھوڑے نے ملک کے کوارٹر میں ملاقات کا انتظام کر دیا۔ملک ُوادی سون کے ڈاکو محمد خان کا عزیز تھا۔ پانچ سو روپیہ سکہ رائج الوقت بلوچستان میں معجل ادا کرنے سے بلوچستان کے کسی بھی علاقے کا لوکل ڈومیسائل سرٹیفکیٹ ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے بن جایا کرتا تھا۔ پنجاب، سرحد، افغانستان، ایران کے تمام بے روزگار جوق درجوق بلوچستان کا رخ کر رہے تھے اور جعلی لوکل یا ڈومیسائل بنوا کر نوکریاں حاصل کر رہے تھے۔جس گاؤں کا پہلا مجاہد نوکری حاصل کرتا تھا، پورے کے پورے گاؤں کو بلوچستان کی ملازمتوں میں فٹ کر دیا کرتا۔بعض نیک دل ڈپٹی کمشنروں نے ریٹ مزید کم کر دیا تھا تاکہ فنی بیٹیوں پر نظر گاڑنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ملک، بھی بلوچستان کا ڈومیسائل بنوا کر ریلوے میں ملازم ہوگیا۔کوارٹر بھی حاصل کرلیا۔ اِدھر اُدھر تعلقات بھی بنانے لگا۔ جب شادی کرے گا، بچے پیدا ہوں گے تو بلوچستان کی میڈیکل اور انجینئرنگ کی سیٹیں انھیں دلوائے گا۔لہٰذا وہ تعلقاتِ عامہ پر زیادہ توجہ دینے لگا۔

گھوڑے کے بارے میں اسے علم ہوا کہ محض اس کی زبان ہی لمبی نہیں، ہاتھ بھی لمبے ہیں تو تعلقات مزید بڑھانے لگا۔گھوڑے کے ذریعہ وہ اپنا کوارٹر ڈیٹ پر دینے کے لیے رضامند ہوا۔حالاں کہ پہلے وہ ہچکچایا تھا۔"استاد گھر تو مقدس جگہ ہوا کرتی ہے۔"

"تمھارے باپ کا گھر ہے، ریلوے کوارٹر ہے۔"

"استاد! میری غیرت ہے۔"

"چپ بے غیرت! اتنی ہی غیرت ہوتی تو بلوچستان کا جعلی ڈومیسائل نہ بنواتے۔محمد خان ڈاکو یا چراغ بالی ڈاکو کی طرح شرافت سے بسیں لوٹتے۔"

"مگر استاد اخلاقی طور پر سوچو، جس بستر پر میں رات کو تسبیح پڑھتا ہوں۔۔۔۔" ملک منمنایا۔

گھوڑے نے اس کے دل پر ایک اور دولتی جڑی: "تسبیح پھیروں کس کو گھیروں۔ زوے! دوستی کی انتہا بھڑوا گیری کی ابتدا ہے۔"

ملک کو ہاں کہتے ہی بن پڑی۔ اس کا گول مٹول سا چہرہ تھا، جیسے کسی صحت مند خاتون کے سینے کی ایک گولائی اتار کر ملک کی گردن پر جوڑ دی گئی ہو۔ تا کہ وہ بطور چہرہ کام آوے۔ ملک کو اپنے پیدا ہونے والوں بچوں کی فکر دامن گیر ہوئی تو تابڑ توڑ دھمکیوں سے گھبرا کر درد بھری فریاد کی: "استاد ہاتھ ہولا رکھو۔"

گھوڑے نے بابو کو یہ مژدہ جاں فزا سنایا کہ اب ہر روز، روز عید ہے، وہ گھنٹوں نسیم کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ کس سیما تک، یہ گھوڑا انہیں پوچھے گا۔

"بابو! میں نے تم دونوں کی آخری آرام گاہ کا انتظام کر دیا ہے۔"

بابو چونکا، "کیا بولتا ہے!"

"یعنی جہاں آرام سے دن بھر رہ سکو گے۔ چھت پر پانی کی ٹینکی بھی خاصی بڑی ہے۔"

خالو نے کھانے پر سفید ریش مدعو کیے۔ اتنی طویل محلے داری میں یہ پہلا کھانا تھا۔ سبھی کو اچنبھا ہوا۔ ملازمت کے دوران خالو نے ٹھیکے داروں سے کام لیا تھا۔ خود عملی طور پر ٹھیکے داری نہیں کی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مرد حج یا دوسری شادی کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ریٹائرمنٹ کی شادی سے بہتوں کا بھلا ہوتا ہے، خصوصاً پڑوسیوں کا۔ خالو کا سرمایہ ہی ٹھیکے داری میں ڈوب چکا تھا۔ اُدھر اس کے حقیقی بھائی نے حیدرآباد والے مکان پر سسرالی قبضہ کرلیا۔ کیوں کہ وہ خالو کا ہم زلف بھی بن چکا تھا، اس ناتے وہ خاص Deterrence پھیلا رہا تھا۔

انور کے والد بھی اس کھانے میں شامل تھے۔ انور نے التجا کی کہ موقع پاتے ہی خالو سے کہا جائے کہ وہ بابو کی شادی نسیم سے کر دے۔ پورے علاقے کا بھونچال ختم ہو جائے گا۔ بابو کی روح کو بھی مکتی مل جائے گی۔ لیکن وہاں عقدہ کھلا کہ الیکشن کی دعوت کی طرح اس میں خالو کی غرض آشکارا تھی۔

کھانے کے بعد خالو نے دکھی دل سے چار نکاتی پروگرام پیش کیا۔

اول : سفید ریش معززین علاقہ بابو کو مجبور کریں کہ نسیم کا خیال دل سے نکال دے۔

دوم : بابو راجھستانی لڑکی سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

سوم : نسیم کے خاندان پر دباؤ ڈالا جائے کہ نسیم کو بابو سے ملنے نہ دیں۔ ملازمت چھڑوا کر گھر میں قید کرلیں۔ زنجیریں بے شک نہ ڈالیں مگر بابو سے ملنے نہ دیں۔

چہارم : نسیم کی کسی خاندانی، شریف، صاحب جائیداد، نجیب الطرفین نوجوان سے شادی کرادیں۔

خالو کے سارے سوال شہزادی مہر النسا والے تھے جو اس نے کبھی حاتم طائی سے کیے تھے۔ یقین واثق تھا کہ اگر حاتم طائی زندہ ہوتا تو ضرور اسے مال دیتا اور بابو کی مدد کرتا۔ باری دھوبی کی دکان سے اٹھا کر لیلیٰ سے ملا دیتا اور شمشیر آبدار سے خالو کو چلتا کرتا۔ دوست خالو کی قبر پر یہ بینر لگوا دیتے؛ ''حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔''

خطرناک سوالات سنتے ہیں حاضرین پر سکتہ چھا گیا۔ کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور پھر خالو پر تابڑ توڑ حملے شروع کردیے کیوں کہ سبھی کو بابو سے دلی ہمدردی تھی۔

''آپ اتنے متعصب کیوں ہیں؟ نسیم میں بھلا کیا حرج ہے؟''

''وہ غیر ہے۔ ہم راجھستانی ہیں۔'' خالو گرجا۔

''آپ راجھستانی ہیں تو یہاں کیا لینے آئے؟''

''ہم آزادی چاہتے تھے۔ ہم نے پاکستان بنا دیا۔''

''ہر قوم اپنے وطن میں آزادی لیتی ہے۔ انگریز، افریقہ بھاگ جائے اور اعلانِ آزادی کرے۔ فرانسیسی، ایران میں جا کر آزادی کا اعلان کردے، یہ وہاں کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ راجھستان میں آزادی کا اعلان کرتے۔ آپ نے ہمارا معاشی قتل کردیا ہے۔ آپ کیا کوئٹہ میں اپنا گھر دو ہزار مربع فٹ کا راجھستان بنانا چاہتے ہیں۔ ہم نے کیا آپ کو دعوت نامہ بھیجا تھا کہ ضرور بہ ضرور تشریف لائیں۔ آپ کون سی آزادی، اپنے ساتھ لائے ہیں۔'' کسی دل جلے بزرگ نے سوال داغا۔

''اپنے بیٹے کو تو آپ شادی کی آزادی نہیں دے رہے۔ آپ کیسے آزادی پسند ہیں؟'' ایک صاحب کشف بزرگ گرجے۔

''اور یہ کیا بے ادبی ہے؛ کلمہ طیبہ کو آپ نے ایک سیاسی نعرے سے جوڑ دیا۔ پاکستان کا

مطلب کیا۔۔۔کلمہ طیبہ ہے۔ کیا کلمہ طیبہ کی وضاحت پاکستان ہے۔ افسوس صد افسوس، کتنا افسوس ناک ڈرامہ کیا۔ کلمہ طیبہ پڑھ پڑھ کر آپ نے ہم کو حلال کر دیا۔ سبحان اللہ۔"

خالو بہت پریشان ہوا۔" آپ صاحبان نہایت ہی متعصب ہیں۔ لیجیے چائے پیجیے۔ سچ کہا ہے بزرگوں نے بھینس کے آگے روئیں، اپنے نین کھوئیں۔"

چوں کہ مہمانِ گرامی کو محاورہ سمجھ نہ آیا' وہ خوش دلی سے سبز چائے کے مزا کے لیتے رہے ہیں۔ سچ کہا بزرگوں نے' کم زور اُردو کے بڑے فوائد ہیں بابا۔

A little knowledge of Urdu is a bliss

خالو حالات کا ستایا ہوا تھا۔ وہ لوگوں سے مدد مانگتا پھر رہا تھا اور بابو مزاروں سے۔ جہاں کسی بزرگ کا پتا چلتا، جھٹ وہاں پہنچ جاتا۔ ایک دن زمبیا کا اسکوٹر لے کے دوڑا دوڑا چلا آیا انور کے پاس۔ انور کمرہ بند کر کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ٹیبل لیمپ کے سبب اسے گرمی بھی لگ رہی تھی۔ بابو بولان میل کی طرح جلدی میں تھا۔

"فوراً پیچھے بیٹھو، ضروری کام ہے۔" بابو کے سر پر سفید ٹوپی تھی۔

"یہ یہودیوں والا سفید Scalp Cap کیوں سر پر ڈالا ہے؟" انور نے اعتراض کیا۔

بابو نے فریاد کی۔ "ضروری کام ہے۔"

اس نے اسکوٹر دوڑایا اور انور کو کاسی قبرستان لے گیا۔ جیب سے خزانے کا نقشہ نکالا اور کوئی دفینہ ڈھونڈنے لگا۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ خوار کر دیا۔

"بابو! خزانہ ڈھونڈتا ہے؟ آدھا آدھا کرنا۔"

بابو نے اس گرم دوپہر میں مزید قہر بھری نظروں سے دیکھا۔

"خاموش رہو دولت کے پجاری۔" بابو نے جھڑک کر رکھ دیا۔

"بابو پھر سٹی نہیں ہوئے گا۔ آدھا آدھا ہوئے گا وزن کر کے۔ ترازو بھی ہم پکڑے گا۔"

گھنٹہ بھر کی محنت کے بعد بابو ایک قبر کے پہلو میں آن بیٹھا۔ آنکھیں بند کیں، ہونٹ کپکپانے لگے۔

انور کو Good, Bad and Ugly والی فلم کا قبر خزانہ والا منظر یاد آ گیا۔

"اس کے اندر خزانہ ہے؟ کدال کدھر ہے!"

"داشتی، اس میں اصل خزانہ ہے۔ اس میں نسیم کا والد ہے۔ ہم اس کو بولتا ہے کہ ہمارا شادی کرادیو۔"

انور بھنا گیا۔"بریلوی! ہم کو کدھر لے آیا۔ تم یہ دعا گھر میں بھی مانگ سکتا تھا۔ کل ہمارا پرچہ ہے نسیم کا باپ نے شادی دفتر کھولا ہے کیا۔ زوئے یہ ہڑادوڑی چھوڑو، جو ہم اپنا پڑھائی کرے۔ تم خود تو خرنالائق ہے۔ میٹرک تھرڈ ویژن۔"

بابو نے دعا مانگنے کے بعد آنکھیں کھولیں۔ ایک نگاہِ کدورت سے انور کو نوازا، اور یہ شعر ذبح کیا۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غالب صاحب ادراک شاعر تھا مگر اسے یہ علم نہ تھا کہ اہلِ کوئٹہ اس کے شعروں کو تلفظ سے ذبح کریں گے، ورنہ اپنے جگر گوشوں اپنے شعروں کو کبھی بلوچستان میں داخل نہ ہونے دیتا۔ شاہی واہ یا مٹھا رندی پر ہی روک لیتا۔ اپنا پورا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام مدون کر کے اپنا دیوان دریائے بولان میں ڈبو کر چلتا بنتا۔ بہادر شاہ ظفر کے پاس رنگون میں جا پناہ لیتا۔ بہادر شاہ ظفر دفن کے لیے خوش نصیب ثابت ہوا۔ دہلی میں تو اولیااللہ کے مزار ہیں، جب کہ رنگون میں اسی کا مزار مرجع خلائق ہے۔ ہر جمعرات کو میلہ سا لگتا ہے مزار پر۔

دوست خفا ہو رہے تھے۔

"بابو تم دعوت کا دن کدھر چھپر ہو گیا تھا۔ اتنے لوگیں بیٹھے تھے۔ اپنا کام کرتا۔ وہی وقت تھا، پٹو ڈالنے کا۔ سب کو تمھارا ساتھ ہمدردی ہے۔"

بابو نے لاتعلقی سے سگریٹ کا کش مارا۔

"بابو دعوت کی رات تم کس چلہ کوٹھی، کس گنتہ خانہ میں تھا گوڈرا۔ کس کا فرکنج میں تھا۔"

بابو نے بہ صد تکلف ارشاد فرمایا "یار ہم ممتاز کے گھر قوالی میں بیٹھا تھا۔ آدھا حصے میں پردے تنے تھے۔ جب قوالوں نے گایا: تیری صورت نگاہوں میں پھرتی رہے، عشق تیرا ستائے تو میں کیا کروں' تو ہم کو حال چڑھ گیا۔ بس مت پوچھو، مریدوں نے سنبھالا۔ ہمارا آس پاس مریدوں نے گھیرا ڈال دیا کہ گرے نہیں۔ ایک گھنٹہ تک حال چڑھا تھا۔ عبدالرحمان کانج والا قوالی کر رہا تھا۔"

"بابو! تم نے بچھو کا زہر پیا ہوگا۔ محسوس کیا ہوتا تھا؟"

"یار ہر طرف نسیم تھا۔ زمین نسیم، آسمان نسیم، ہم خود بھی نسیم تھا۔ آج رات بھی قوالی ہے۔ سارے دوست چلیں گے۔"

"اور جو میرا امتحان ہے بابو۔"

"گولی مارو امتحان کو۔ پیر ساب کا نظر ہو گیا تو خود پاس کرا دے گا۔"

"پیر ساب اگر اتنا ہی ولی ہوتا تو علامہ اقبال کی طرح چھ مہینے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے لیتا اور پیر ڈاکٹر پی ایچ ڈی بن جاتا۔"

"علامہ اقبال کا ڈگری فراڈ ہے، چھ مہینے میں جرمن زبان سیکھا، وہ بھی علمی زبان۔ پھر اسی چھ مہینے کا اندر مقالہ لکھ دیا۔ تھرڈ ڈویژن میں ایم اے فلاسفی کیا۔ کوئی اور تھا ہی نہیں۔ بس پھر کیا تھا گولڈ میڈل بھی مل گیا۔ یار ہم کو تو اب تک نہیں آیا اردو۔"

اسی نوک جھونک میں گھر پہنچے۔ قبرستان یاترا کے بعد غسل کیا جاتا ہے۔ انور کا مزید وقت ضائع ہو رہا تھا۔ وہ شاور کے لیے دوڑا۔

سر شام گھوڑے کی معیت میں سارے دوست انور کو لینے آ گئے۔ فرار کے تمام راستے انور کے لیے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ بہانہ سازی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، حتیٰ کہ گھوڑے نے حکم دیا کہ انور کو سیاسی لیڈر کی طرح اٹھا کر لے جایا جائے۔ کندھوں پر نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں سے پکڑ کر جھلاتے ہوئے، ڈنڈا ڈولی کر کے۔ یہ سن کر انور خود ہی شرافت سے چل دیا۔

قوالی کی محفل میں انھوں نے آگے جگہ بنائی۔ چوں کہ ممتاز کے دوست تھے، ممتاز مقام

ملا۔ قوالی شروع ہوئی تو ویل دینے کا سلسلہ چل نکلا۔ صدیق نے فوراً اسٹریٹیجک موو کی کہ جب سامعین کو روحانیت کے کرنٹ سے دورہ پڑے گا، وہ حال کھیلیں گے تو صدیق بھی حال کھیلے گا، اس وقت اس کی اعانت کی جائے۔ پیر روشن ضمیر کی آنکھیں تو یوں بھی مندی ہوئی تھیں، وہ برابر جھوم رہے تھے۔ مریدوں پر روحانی فیوض کی بارش کر رہے تھے، جواباً مریدان پر قائد اعظم کے نوٹوں کی بارش کر رہے تھے۔ نیلے قائد اعظم، سرخ قائد اعظم، قائد اعظم ہی قائد اعظم۔ یہ دیکھ کر گھوڑے کی بھی رال ٹپکنے لگی۔ زمبیا اور بابو سیر چشم تھے مگر ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ اہلِ حال تو سروقد حال کھیل رہے تھے جب کہ صدیق بیٹھا بیٹھا حال کھیلنے لگا۔

"مرشدی۔۔۔۔ مرشدی!" وہ بلبلا اٹھا۔ مرشدی نے دایاں ہاتھ بلند کر کے آشیرباد دیا۔ صدیق نے بیٹھے بیٹھے بریک ڈانس شروع کر دیا۔ پھر چاندنی پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ایسا تڑپتا پھڑکتا کسی نے کب دیکھا ہوگا۔ خواتین میں کھلبلی مچ گئی کہ مبادا صدیق، پیر کے روحانی جھٹکے برداشت نہ کر سکے۔ مریدین تو نوٹ پھینک رہے ہیں، صدیق وجد میں آ کر کہیں زندگی نہ لٹا دے۔ لیکن پردے کے پیچھے نسیم زیرلب مسکراتی رہی۔ بابو نے اپنے دوستوں کا تعارف بخوبی کروا رکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ صدیق ڈراما کر رہا ہے۔ عنقریب یہی پیر کا جھٹکا کر دے گا۔

صدیق زمین پر گر پڑا، اور ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا رہا۔ بظاہر تو چاہا کہ پیر کے قدموں پر گرے مگر راہ میں حائل نوٹوں پر گر پڑا، اور لگا تڑپنے۔ گھوڑا، انور، زمبیا اور بابو ایک ساتھ لپکے اور صدیق کو چاروں طرف سے گھیر لیا، مگر وہ قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

پیر نے خطرہ بھانپتے ہوئے مریدانِ خاص کو اشارہ کیا۔ انھوں نے لپک کر صدیق کو اٹھایا اور دوبارہ اس کی نشست پر لٹا دیا۔ قوالی کے آداب کے مطابق جب کسی کو حال چڑھتا ہے تو جب تک وہ شخص ہوش میں نہ آئے، قوالی آگے نہیں بڑھتی۔ ورنہ اس شخص کی موت کا احتمال رہتا ہے۔ لہٰذا وہ اسی تکرار پر اٹک گئے: "تیری صورت نگاہوں میں پھرتی رہے۔" بار بار ایک مصرع کی تکرار تھی اور بابو باریک پردے کے پیچھے بیٹھی نسیم کو دیکھ دیکھ کر جھوم رہا تھا۔ ساتوں آسماں پار کر کے تجلیات میں گم ہو گیا۔ بارے صدیق نارمل ہوا تو قوالی آگے چلی۔

قوالی تو آدھی رات تک جاری رہی، وہ باہر نکل آئے۔ سخت بھوک لگ رہی تھی۔ پھل کی ریڑھی والا حسبِ معمول پھل کپڑے سے ڈھانپ کے چلا گیا تھا۔ انھوں نے بند کھولے، کپڑا ہٹایا اور پھل کھانے لگے۔ اتنی روحانی طاقت کھائی تھی، کچھ جسمانی طاقت بھی ضروری تھی۔

چوکیدار دوڑا چلا آیا۔ ''تم لوگ فروٹ کیوں کھاتی؟''

گھوڑے نے سیب چباتے ہوئے ڈپٹ پلائی، ''ہم لوگ اس لیے کھاتی کہ ممتاز کے ہم مہمان ہوتی۔ کل ممتاز کے گھر سے ریڑھی والا پیسہ لیتی۔ یہ لیو تم بھی کھاتی۔''

گھوڑے نے فراخ دلانہ طور پر سیب چوکیدار کو بھی پیش کیا۔

وہ برامان کر داڑھی کھجاتا ہوا طرح دے گیا، ''ہم حرام کا مال نہیں کھاتی۔''

زمبیا نے داد دی، اس کے اعلیٰ ظرف کی، ''تم اچھا کرتی۔''

صدیق نے لباس کے خفیہ خانوں، شلوار اور واسکٹ کی اندرونی جیبوں سے مسروقہ مال برآمد کیا اور مستحقین میں مسلمان مجاہدوں کی طرح برابر بانٹ دیا۔ بابو کو البتہ دو حصے دیے۔ ایک بابو کے لیے، دوسرا عشق کرنے کا الاونس۔

بعد میں پیر بہت خفا ہوا۔ ممتاز کے والد یوپی کے تھے۔ بدستور یوپی کی اردو بولتے، جب کہ ان کا ہونہار بروا کوئٹہ کی زبان میں بات کرتا۔ گھر میں زور کی جھڑپ ہوئی۔ پیر کی نگاہِ جہاں دیدہ نے دیکھ لیا کہ جو نوٹ برسے وہ زیادہ تھے، جو ملے وہ کم۔ پیر روشن ضمیر تو اُڑتے پرندے کے پر گن لیا کرتے تھے، بارے انھیں مزید روپیہ دے کر منایا گیا، ورنہ خطرہ تھا کہ وہ ممتاز کے ابا کو دی جانے والی جنت کی سیٹ منسوخ کر دیتے۔ امکان تھا کہ جنت میں بھی یوپی مہاجر اسٹور چلانے دیں گے۔ تلافی ہوئی تو پیر نے ناشتہ کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی اور ریش مبارک میں عطر گلاب کا چھڑکاؤ کرنے لگے۔ اتنے میں ریڑھی والا پھل فروش فریاد لے آیا کہ قوالی سننے والی نیک ہستیاں اس کا اچھا پھل کھا گئیں۔ دین تو بچانے میں کامیاب ہو ہی چکے تھے۔ تھوڑے سے پیسے دے کر پھل فروش کو ٹالا، ورنہ وہ تہیہ طوفان کیے ہوئے آیا تھا۔

ممتاز نے پھر انھیں خوب رگیدا، سخت سست کہا، لیکن صدیق کے ایک دانش مندانہ

اقدام سے دوستوں کی عاقبت سنور چکی تھی۔ انھیں دو مہینے کا خرچ مل چکا تھا۔ بابو نے نسیم کے لیے ایک خوب صورت ساسوٹ خریدا۔ وہ اپنی رقم حسن کی دیوی کو دے دیا کرتا تھا۔

نسیم کے خاندان میں اس کی رسائی ہو چکی تھی۔ وہ اسے ایک تباہ حال، بے ضرر عاشق سمجھا کرتے تھے۔ خاندان کا جو بھی کام ہوتا، بابو کو بلوا کر اس کے حوالے کر دیا کرتے۔ بابو اس قدر خوش ہوتا جیسے کہ صدرِ پاکستان نے تمغۂ حسنِ کارکردگیِ عشق مرحمت فرمانے کے لیے بلوایا ہو۔ وہ نسیم کے بھائیوں، بھتیجوں کو سگِ لیلیٰ والی محبت دیتا اور کچھ مطالبہ نہ کرتا۔ اسے تو یہی خوش ہوتی کہ وہ نسیم کے ہاں گیا۔ ان در و دیوار کو دیکھا جہاں نسیم رہتی ہے۔ نسیم چھپاک سے آ کے خرمنِ ہستی کو شعلہ حسن ست جلا کر تجلّی طور کی طرح شرما کر مڑ جایا کرتی اور بابو کئی منٹ اسٹیٹ آف کوما میں رہتا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس کا کندھا ہلا کر دوبارہ دنیا میں واپس لایا جاتا۔ یا اس کے ہونٹوں سے سگریٹ کھینچ لیا جاتا، جس سے وہ فوراً ہوش میں آجایا کرتا۔ یہ نسخہ تیر بہدف تھا۔ کھلونے والی گڑیا کے ہونٹوں سے چوسنی کھینچی جائے تو وہ "ماما، ماما" کر کے بولتی ہے۔ بعینہٖ سگریٹ کھینچتے ہی وہ حاضرین محفل سے دوبارہ گفتگو کرنے لگتا۔

راوی بیان کرتا ہے کہ نسیم کے ایک جلوے میں گیارہ ہزار وولٹ کا کرنٹ تھا۔

"بابو! تم نسیم کو دیکھ کر کلٹی کیوں ہو جاتا ہے؟"

"بس یار کیا بتاؤں۔۔۔ لگتا ہے کہ میں اس دنیا سے کسی اور دنیا میں چلا جاتا ہوں۔" ایک استفسار پر اس نے وضاحت کی تھی۔

بابو کا Would be سسرال بڑا ڈیمانڈنگ تھا" فلاں دوا، لادو، بچے کو ہسپتال لے جاؤ، میونسپلٹی سے گھر کا ٹیکس معاف کرادو، ٹی وی ٹھیک کرادو، مرغی بیمار ہے گھوڑا ہسپتال سے ٹیکہ لگوادو، قربانی کے لیے قصاب کا انتظام کردو، نیز کوئی بکرا سستے داموں لے دو، نیاز کے چاول یتیم خانے میں دے آؤ۔۔۔"

بابو ان کے ہاں پیچ کس لے کے جاتا، کبھی پلاس، کبھی جانوروں کا ڈاکٹر، کبھی الیکٹریشن۔ اس کے دو ہی آشیانے تھے: باری دھوبی کی دکان اور نسیم کا گھر۔ بعض دل جلے پھبتیاں بھی کستے۔

ان کی بیمار بکری کو لیے جا رہا تھا کہ لڑکے کورس کی شکل میں گیت الاپنے لگے:

"جو بجلی ٹھیک کرائے، روز دوڑائے، استری کروائے، ایسی محبت سے ہم باز آئے!"

بابو جھینپا جھینپا سا بکری کی رسی کھینچے گزر گیا۔ آخر بکری تھی تو نسیم کی ہی، مجنوں تو لیلیٰ کے کتے کو بھی گلے لگا لیا کرتا تھا۔ کوئی Poodle ہی ہوگا۔ اگر وہ کتا Saint Bernard ہوتا تو مجنوں بھی بھاگ نکلتا، سوئے نجد۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ بابو کا عشق مہربان کا ٹانگہ ہے جو کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ بابو تمام عمر بکریاں گھسیٹتا، بجلی ٹھیک کرواتا، بچوں کو ہسپتال لے جاتا' خرچ ہو جائے گا۔ اکثر لوگوں کو بابو سے ہم دردی تھی۔ کئی بدشکل دوشیزائیں سوچتیں، کاش بابو ان پر مرتا۔ ایک اور پریشان کن بات یہ تھی کہ محبت کی Paradox دم توڑ رہی تھی۔ ہجر کی آگ میں جل جل کے آہیں بھر بھر کے نسیم تو Over Weight ہوتی چلی گئی جب کہ بابو جونیپر کے درختوں کی طرح سوکھتا چلا گیا۔ بڑی پریشان کن صورت حال تھی۔ قریبی دوستوں کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ شب وصال کہیں بابو کی Crush Injury ہی نہ ہو جائے۔ جیسے ٹرک کے پہیے کے نیچے تین پہیوں والی بچوں کی سائیکل کا ممکنہ حشر دکھائی دیتا ہے۔

زمبیا نے خدشات کا اظہار کر ہی دیا۔ "بابو تم اتنا غرق ترک رہتا ہے۔ عشق نے تم کو گلٹی کر دیا۔ نسیم اتنا پنڈ (موٹی) کیسے ہوگیا۔"

بابو نے برا مانا۔ "زوئے تم کیا بلا مانگتا ہے۔"

مگر صورت حال دل چسپ ہوتی جا رہی تھی۔ فلموں میں بھی مجنوں کا وزن لیلیٰ کے برابر ہی بنتا۔ محض چیتھڑے پہنے پھرتا، جس سے علم ہوتا کہ سچا عاشق ہے۔ کم از کم ویٹ پرابلم نہیں تھا۔ بابو "لیلیٰ مجنوں" فلم دیکھ کر بہت آزردہ ہوا۔

"ایسا لگتا ہے یہ ہمارا کہانی ہے۔"

"مجنوں ریت میں دب کے مرا تھا، تم محبوبہ کے وزن سے جان آفریں خدا کے سپرد کر دو گے۔"

گھوڑے کو نت نئی سوجھتی، فرمایا۔" زوئے تم اتنا بڑا عاشق ہے، کوئٹہ کا سب سے بڑا عاشق، تم عاشقوں کا عاشقو بدمعاش ہے۔ تم عاشقوں والا وردی پہنو جو مجنوں نے پہنا تھا۔"

یوسف نے گرہ لگائی۔" بابو! تم ایسا خاندانی عاشق ہے، تم کو ممٹھا کرنہ لے جائے۔"

بابو لاتعلق ہو کر سگریٹ پھونکتا چلا جاتا۔ وہ کسی دوست سے ناراض نہ ہوا کرتا۔ پھر اس نے سرد آہ کھینچی، جیب بھی خالی تھی۔ ڈبیا میں بھی آخری سگریٹ۔" یہی آخری بچی ہے ترے ہجر کی نشانی۔" اور سگریٹ پھونکنے لگا متفکر انداز میں۔

اس نے چندہ برائے مسجد کی طرح آخری سگریٹ لہرا کر دوستوں کو دکھایا اور سگریٹ پینے لگا۔ صدیق نے کوئی نیا ڈاکا نہ ڈالا تھا، مگر گدائی میں بھی اللہ وال تھا۔ غیور اتنا کہ جھٹ کچھ روپے بابو کے حوالے کر دیے۔" جارسم!"

بابو چہکا۔" جس کے تم جیسے دوست ہوں، اسے دشمن کی کیا ضرورت۔ ہاتھی کا منہ میں تم زیرہ دیتا ہے۔ واہ رے تیری بخشش ۔۔۔ ملے پیاسے کو شبنم۔"

مالک بڑا کارساز ہے۔ کچھ قبولیت کی گھڑی تھی۔ بابو کے روزگار کا مسئلہ حل ہو گیا۔ خالو بھی ماہ پہلے بابو کے پر قینچ کر چکا تھا۔ اس کا ہنڈا فروخت کر چکا تھا۔ بابو نے اصرار کیا کہ اسے اسکوٹر دلوایا جائے۔ خالو کا ہاتھ تنگ تھا مگر دیکھا کہ ہم چشموں کے پاس اسکوٹر ہیں۔ بابو ان سے لفٹ مانگتا رہتا ہے تو جیسے تیسے اسکوٹر دلوا دیا۔ بابو دوبارہ روایتی موبیلیٹی میں آ گیا۔ خالو نے وارننگ بھی دی کہ اگر اس نے نسیم کے کسی رشتہ دار کو بابو کا اسکوٹر چلاتے دیکھا تو فوراً گولی مار چوک پر اسکوٹر کی نیلامی کروا دے گا۔ بابو نے چاروناچار خالو کا فیصلہ قبول کر لیا۔

اگلے ہی روز خالو نے دیکھا کہ بابو بغیر اسکوٹر کے یونیورسٹی گیا ہے۔ دراصل وہ ملک کے کوارٹر میں نسیم کے ساتھ ڈیٹ پر گیا تھا۔ اور اس وقت وہ چکی کے دو پاٹوں میں پس رہا تھا۔ ادھر خالو کا دل بھر آیا۔ بابو سے ہمدردی جاگی۔ اسے تاسف بھی ہوا۔ باپ کی باپتا (بروزنِ مامتا) جاگ اٹھی۔

اسکوٹر لے کر یونیورسٹی پہنچا تو متعلقہ شعبہ کے صدر نے بابو کی شناخت سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ بہت کریدا تو فرمایا، "اچھا وہ جو ہمارے آوارہ سے طلبا انور وغیرہ کا دوست ہے؟"

"جی ہاں" خالو نے ہچکچاتے ہوئے اقرار کیا۔ اسے یہ نسبت گراں گزری تھی۔

''بابو کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں، نسیم والا ناں، وہ تو کالج میں بھی نہیں پڑھا۔ یونیورسٹی تو دور کی بات ہے۔''

خالو کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ بوکھلا کر ڈگری کالج اسکوٹر دوڑایا۔ پرنسپل جانے کہاں تھا، وہیں ایک لیکچرر نے جو کہ پڑوس میں ہی رہتا تھا، یہ گوہر افشانی فرمائی کہ بابو محض میٹرک پاس ہے، تھرڈ ڈویژن۔

خالو سراسیمگی کے عالم میں کالج کے عقب میں گزرتی ریلوے لائن پر دھرنا مار کے بیٹھ گیا۔ کوئٹہ پسینجر سیٹیاں مارتی خالو کی جانب بڑھی تو معاً اپنی بیٹیوں کا خیال آیا کہ ان کا کیا بنے گا۔ بابو تو انھیں نسیم کی لونڈیاں بنا دے گا۔ مضطرب ہو کر اٹھ بیٹھا اور گھر کی راہ لی۔

راستے میں دیکھا کہ دھلے ہوئے کپڑوں اور استریوں کی اوٹ میں بیٹھا بابو دھوبی کی دکان میں تیزی سے محبت نامہ رقم کیے جا رہا ہے۔

فرطِ غم سے خالو بھی دکان میں میلے کپڑوں کے گٹھرے کی مانند جا گرا۔ بابو نے خط لکھنا موقوف کیا، خالو کو سنبھالا۔ خالو کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

بابو کے چہرہ مبارک پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور بھرائی ہوئی، کپکپاتی، لرزتی، کانپتی آواز میں فریاد کی: ''لعنت برزنِ نیک بدرا چہ گویم۔ بابو تمھاری زندگی تباہ ہو گئی، نسیم کی خاطر۔ تم صرف میٹرک پاس ہو، وہ بھی تھرڈ ڈویژن۔''

بابو سچا جوان تھا۔ بلا پس و پیش قبول کر لیا۔ خالو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اسکوٹر پر بٹھا کے محکمہ ٹیلیفون کے دفتر لے گیا۔ اعلیٰ افسروں سے تعلقات تھے، کہہ سن کر بابو کو کلرک لگوا دیا۔

افسر نے بابو کو پروانہ تقرری دیتے ہوئے نصیحت کی۔

"To be a clerk is an art, to remain a clerk is a sin"

نوکری سے زندگی میں کچھ باقاعدگی آ چکی، ماہ بہ ماہ تنخواہ بھی ملنے لگی۔ جس سے بابو کا اپنا خرچہ نکلتا، جس سے وہ حسن کی غیر معمولی طور پر موٹی دیوی کو بھینٹ چڑھایا کرتا تھا۔ دوست بھی اسے فراخ دلی سے ادھار دیا کرتے۔ خصوصاً غلام حسین جمالی، جسے عمومی طور پر ادا (بھائی) کہا جاتا تھا۔ وہ

بچپن ہی سے بڑے بھائیوں والا برتاؤ کیا کرتا تھا۔ کبھی قہقہہ لگا کر نہ ہنستا۔ بڑے رکھ رکھاؤ والا انسان تھا۔ بابو اکثر اسی سے ادھار لے کر پریم کے مندر پر چونا قلعی پھیر دیا کرتا۔ جمالی سے گاڑی بھی مانگ لیا کرتا، نسیم کے لیے۔

زیبا سے افتخار عرف ٹیڈی کا عشق زوروں پر تھا۔ زیبا کے بھائیوں سے چند بار لڑائی بھی ہوئی۔ زیبا نے ساتھ جینے مرنے کی قسم دے رکھی تھی۔ دنیا تو بڑی وسیع تھی۔ افتخار زیبا کی قسموں کے ہاتھوں مجبور ہو رہا تھا، حالاں کہ افتخار کو خاصی لفٹ تھی۔

افتخار اور زیبا کے بھائی میں ایک روز سخت لڑائی ہوئی۔ افتخار نے اس کی خوب پٹائی لگائی۔ اس نے بھاگ کر اپنے بڑے بھائی کو بپتا سنائی۔ اس وقت شفو جو کہ اسے کے بڑے بھائی کا گہرا دوست تھا، ساتھ ہی بیٹھا دکان میں چرس سے شوق فرما رہا تھا۔ انھوں نے طیش میں آ کر سائیکلیں اٹھائیں اور افتخار سے بدلہ لینے چل پڑے۔

عین افتخار کے گھر کے سامنے اسے جا لیا۔ گھر میں گھس کے چھپ جانا، یا بھاگ جانا بھی بزدلی تھی۔ افتخار نے چاقو کٹ کٹ کر کے کھولا۔ خیال تھا کہ سائیکلیں رک جائیں گی مگر دشمن بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا۔ افتخار نے لپک کر زیبا کے بڑے بھائی کے کولہے میں چاقو گھونپ دیا، جس سے وہ سائیکل سمیت گر پڑا۔ شفو اور باقی ہمراہی اسے سنبھالنے میں لگ گئے۔ دشمن پر کاری ضرب لگانے کے بعد میدان چھوڑنے میں مصلحت تھی۔

شام میں پولیس والے ڈھونڈتے ہوئے آئے۔ تھانے دار نے اس کی والدہ سے کہا کہ

ہو جاتی ہے نوجوانوں میں لڑائی، اتنی بڑی بات نہیں ہے، افتخار سے کہہ دیجیے گا کہ آجائے تھانے۔ میں سنبھال لوں گا، کوئی اتنی بڑی بات تو ہے نہیں کہ چھپتا پھرے۔

اس ہمدردانہ پیغام سے افتخار کا حاصلہ بڑھا۔ گرلز کالج اور مشن روڈ اسکول کے طواف کیے بنا مزید جی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا گھنٹہ بھر میں ازخود تھانے پہنچ گیا۔ تھانے دار نے بتایا کہ معمولی سا زخم لگا ہے، ٹھیک ہے تقریباً، کچھ دے دلا کر صلح ہو جائے گی۔ تھانے دار کے کہنے پر افتخار نے تحریری بیان میں اقبالِ جرم کیا کہ اسی نے چاقو مارا ہے۔

اقبالی بیان کو تحویل میں لینے کے بعد تھانے دار نے گوہر افشانی فرمائی "بیٹا، تمھارے چاقو سے وہ مر چکا ہے۔ دراصل چاقو کے گردے میں لگا۔ اب ذرا حوالات میں آرام کرو۔"

افتخار گزشتہ پانچ برس سے جیل میں ہی سڑ رہا تھا۔ اس کے جیل جانے کے دو ماہ بعد ہی زیبا شادی کر کے نئے پیا کے گھر چلی گئی۔ دوست کبھی کبھار اس کی خیریت پوچھنے پیشی پہ جایا کرتے۔ ایک بار اس کی والدہ نے بابو کو کچھ سامان دیا کہ وہ افتخار کو پہنچا دے۔ افتخار اپنا غم بھول کر بابو سے اس کے عشق کے بارے میں پوچھنے لگا۔ حالاں کہ افتخار سخت Misogynist ہو چکا تھا مگر اسے بابو سے دلی ہمدردی تھی۔ بابو نے بتایا کہ شادی نہیں ہو رہی، زندگی تباہ ہوئے جاتی ہے، کوئی مددگار نہیں، کوئی آسرا نہیں ہے۔

افتخار نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اہلِ بیت سے طلب کرے۔ بابو نے یہ سوچے بغیر کہ افتخار اہلِ بیت سے مودت رکھتا ہے، کہہ دیا، "تم تو مولائی ہو، تم خود پانچ برس سے جیل میں پڑے ہو۔"

افتخار کا ایمان مضبوط تھا، کہا، "وہ اپنوں کو بعد میں دیتے ہیں، غیروں کو پہلے نوازتے ہیں۔"

بابو تو یوں بھی ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ زمبیا کو بتایا تو زمبیا نے بھی یہی صلاح دی۔

سعودی ریال، امریکی ڈالر دور کی بات تھی، ان دنوں سنی شیعہ سبھی محب اہل بیت ہوا کرتے۔ سنی بھی مجالس سنتے، چاولوں کی دیگیں بنوا کر امام بارگاہوں میں بھجوایا کرتے، اپنے کم عمر بچوں کو حضرت امام حسین اور علی کا فقیر بنا دیا کرتے تا کہ روحانی طور پر امام انھیں اپنی حفاظت میں رکھیں۔ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو لیے محرم کے جلوس میں گھس کر علم کے نیچے سے گزارتے۔

ماتمی دستے انھیں راستہ دے دیا کرتے کہ محبت کسی کی جاگیر نہیں ہے۔

بابو بھی دعا مانگنے چلا گیا۔ اس نے منت مانی کہ نسیم سے شادی ہو جائے تو نویں محرم میں علم دیا کرے گا۔ محرم میں ایک دیگ چاول نیاز دیا کرے گا۔ مجالس میں شریک نہ بھی ہو سکا تو شام غریباں میں ضرور شامل ہوا کرے گا۔

ان ہی دنوں گھر میں نسیم کے نام پر جھڑپ ہو گئی۔ خالو کے ہاتھ چھڑی لگی۔ اس نے بابو کی پٹائی کی تو بابو جان بچانے کو باہر بھاگا، کیوں کہ بوڑھے باپ کا ہاتھ روکنا اسے منظور نہ تھا۔ انور اسے ملنے آیا تھا۔ وہ اچانک کود کر بابو کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بابو کے سر پر پڑنے والی چھڑی انور کے ماتھے پر لگی اور خون پھوٹ پڑا۔ خالو کو سخت تاسف ہوا۔ انور نے پرواہ نہ کی بلکہ خالو سے کہا کہ بابو کو معاف کر دے، کم از کم اس خون کی خاطر جو اس کے ماتھے سے بہہ نکلا تھا۔ خالو خاصا پشیمان اور آزردہ خاطر تھا کہ مفت میں انور کا سر پھوڑ ڈالا جب کہ اس کا والد خان بھی غصیلا انسان ہے۔

شیر و بکری دونوں گھر چلے گئے تو انور بھی خون دھونے گھر چلا آیا۔ یہ محض اتفاق ہی ہے کہ والد نے دیکھ لیا۔ مسکرا کر پوچھا، باکسنگ میں ناک سے خون نکلا کرتا ہے، تیرا ماتھے سے کیسے نکل آیا۔ کیا خوب جنگجو بیٹا پایا ہے۔ انور نے ماجرا سنایا تو خان سخت غصے میں آ گئے۔ خالو اور بابو کو بلوا بھیجا۔ خالو کا خیال تھا کہ چوں کہ نادانستہ طور پر اس نے انور کا سر پھوڑ ڈالا ہے، اب اس کے بیٹے کا سر پھوڑا جائے، لہٰذا چلا آیا، سہما سا۔

انور کے والد خان نے باپ بیٹے کو چائے پلائی، کچھ حرفِ شکایت زبان پہ نہ ڈالا۔ خالو سے فقط اتنا کہا، ''آپ اس کا شادی نسیم سے کیوں نہیں کرتے؟''

''اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔''

''ہو جائے گی کیا، تباہ ہو چکا ہے زندگی، کچھ آپ نے بیٹے کا غم نہیں کیا۔ کیا آپ اس کا شادی نسیم سے کرو گے؟''

''ہرگز نہیں۔ میری لاش سے بارات گزرے گی۔''

خان کا چہرہ تاثرات سے عاری رہا۔ اس نے سفید ریش بلوا بھیجے۔ نسیم کے بھائی کو پیغام

بجھوایا کہ معززین علاقہ آرہے ہیں، نسیم کا رشتہ مانگنے، خاندان کے مرد انتظار کریں۔

خان نے حتمی فیصلہ سنایا۔

"یا آپ راجستان چلے جاؤ، واپس بوریا بستر لپیٹ کر یا ہمارا ساتھ بابو کا رشتہ مانگنے چلو۔ کفر کا حکومت قائم رہ سکتا ہے، ناانصافی کا نہیں۔ جدھر ظلم و ناانصافی ہو جائے اُدھر قدرت کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ آپ کا وجہ سے بارش بھی کم کم ہوگیا ہے۔ بچہ لوگ ٹکر ٹکر پانی کا لیے دربدر ہے۔"

خالو بدک گیا۔"کوئٹہ میں برف و بارش میری وجہ سے نہیں ہو رہی کیا۔ سبحان اللہ صاحبان یہ کیا فرما رہے ہیں۔"

معززین نے خان کی ہاں میں ہاں ملائی۔"خان ٹھیک بولتا ہے، تم ناانصاف ہے، ظالم ہے، ماذا اپنا نام مسلمان والا رکھا ہے۔ تم زوڑ کافر ہے۔ اپنا لڑکے پر ظلم کرتا ہے۔"

اتنے میں بابو نے موقع غنیمت جانا، کود کر خالو کے قدموں میں جا گرا، ایک زور کی دھاڑی ماری۔

انور نے ڈراما کرنے کے لیے ماتھے کا خون نہیں دھویا تھا۔"خالو! مان جاؤ ہم تم کو اپنا خون معاف کرے گا۔ تم اتنا ٹسن کیوں کرتا ہے۔ اتنا اڑی مت کرو۔"

"مجھے نسیم پسند نہیں ہے۔" خالو کراہا۔ وہ کسی خوں خوار چرخ کی طرح نرغے میں آچکا تھا۔

خان نے سرزنش کی۔"شادی تمہارا نہیں بابو کا ہے، اس کو پسند ہے۔"

آخر خالو ٹوٹ گیا اور اہلِ مجلس کے ہمراہ نسیم کے ہاں رشتہ مانگنے جا پہنچا۔ جہاں نسیم کے مضطرب بھائی آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے۔

خالو نے نسیم کا بر مانگا۔ جانے خان کو بابو سے ہمدردی تھی یا وہ اپنے لاڈلے کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ خالو کے دل پر ایسے ہی گھاؤ لگانے کے درپے تھا۔ نسیم کے بھائیوں نے ذرا پس و پیش ردوکد کے بعد ہاں کر دی۔ خان کو خدشہ تھا کہ تاخیر کی صورت میں خالو کوئی نیا گل کھلا دے گا۔ اس نے اگلی اتوار کو شادی کی تاریخ طے کر دی۔ خالو دانت ہی پیستا رہ گیا۔ جس سے اس کے چند نقلی دانت ڈھیلے پڑ گئے۔

بابو کی والدہ کو سانپ سونگھ گیا۔ اسے خطرہ تھا کہ موٹی تازہ بہو جس کے بھائی بھی باکسر ہیں، گن گن کر پرانے مظالم کا حساب لینے نہ بیٹھ جائیں۔ وہ بھی سود کے ساتھ۔ کیوں کہ کوئٹہ سود خوروں کے لیے جانب واطراف میں مشہور تھا۔

بابو پہ تو شادی مرگ طاری ہوگئی۔ یہ سکتہ اس وقت ختم ہوا جب گھوڑے نے سم مارے۔ "بابو زوے! یہ تریاں نہیں ہیں۔ ہوش پکڑو، ورنہ ہم مولوی کو بلا کر تمھارا غسل تختہ شروع کردے گا۔"

بابو خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اوسان بجا ہوئے تو دوڑا سوئے امام بارگاہ۔

"نویں محرم کا جلوس کتنی دیر میں نکلے گا؟ میں نے منت کا علم دینا ہے۔"

مخاطب نے غور سے بابو کو دیکھا۔ متبسم انداز میں گوہر افشانی کی۔ "تقریباً آٹھ ماہ بعد جلوس نکلے گا۔ اس وقت علم دے دیجیے۔"

اس وقت بابو کے لیے شادی کا جوڑا ایدھی کا ٹرسٹ بن گیا۔ سب نے کچھ نہ کچھ دیا۔ خان نے خوبصورت قراقلی دی۔ کسی نے بوٹ، کسی نے واسکٹ، غرض یہ کہ تیسری دنیا کے حاکم کی طرح بابو کے پاس سوائے اپنے جسم کے کچھ بھی اپنا نہ تھا۔ حتیٰ کہ اختیار بھی، ذہن بھی اپنا نہ رہا۔ اسے دوست کنٹرول کر رہے تھے۔

بارات نماز ظہر کے بعد تھی۔ صدیق کو بارات کا وقت سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ حالاں کہ میانِ دیر و حرم یک گام ایست۔ چند قدم پہ نسیم کا گھر تھا۔ جس پہ اہلِ محلہ نے جھنڈیاں لگا دی تھیں۔ بارات کے وقت میں پریشانی کی بات نہ تھی۔ صدیق نے گھبرا کر سوال کیا۔ "نماز ظہر کس وقت ہوتا ہے۔ یار آسان زبان میں بات کرو۔ سیدھا بولو۔"

زمبیا کی غیرت ایمانی جاگ اٹھی۔ "زوے تم کو کون مسلمان بول سکتا ہے۔ تمھارا تو نماز جنازہ بھی جائز نہیں۔ زوڑ کافر۔"

"تقریر میں چھوڑ۔۔۔ ٹائم بتاؤ۔"

گھوڑا کسی کافر ملاں کی طرح علم کا سمندر تھا۔ "دوپہر کی نماز کو بولتے ہیں داشتی۔ جو چھٹی

کے ٹائم ہوتا ہے۔"

دوستوں کا خیال تھا کہ جب بھی بابو کی شادی ہو گی، کوئٹہ میں زلزلہ آجائے گا۔ چہار غاش کی کم از کم ایک چوٹی گر جائے گی۔ واقعتاً شادی کے روز ہلکا سا زلزلہ بھی آیا۔ کچھ بوندا باندی بھی ہوئی۔ کوئٹہ شہر کے باسی اسی روز آرام سے خوب پاؤں پھیلا کر سوئے۔

یہ محض اتفاق ہے کہ افتخار کے لیے میڑھ جا رہے تھے سال ہا سال سے، مگر ناکام واپس آتے۔ اسی بار میڑھ کو کامیابی رہی۔ مقتول کے خاندان نے اللہ و رسول کے نام پر افتخار کو بخش دیا۔ انھوں نے تسلیم کر لیا کہ قتل اتفاقی تھا مگر یہ شرط عائد کی افتخار ہمیشہ کے لیے بلوچستان چھوڑ کے چلا جائے۔ مبادا مقتول کا کوئی عزیز طیش میں آ کر افتخار کو قتل کر دے۔

بابو مٹھائی لے کر جیل گیا تو افتخار نے اسے بھی جواباً مٹھائی پیش کی۔ اگلے ہی روز افتخار پنجاب کے کسی نامعلوم مقام کے لیے روانہ ہو گیا کیوں کہ صلح کے بعد کیس ختم ہو چکا تھا۔ اسے رہا کر دیا گیا تھا۔

زمبیا' اور سوز(اوورسیئر) بن گیا۔ پھر ایس ڈی او۔ کچھ عرصہ کے لیے ایران چلا گیا، ملازمت کے لیے۔ وہاں خاصی تنخواہ تھی۔ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی نے ایران کو منی امریکا بنا رکھا تھا۔

انور تو شروع سے ہی آوارہ اور سخت پڑھاکو تھا۔ اس کی داستانِ حیات میں بے شمار بادقاؤں کے نام آتے۔ انور نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا، وہ بھی کوئٹہ سے چلا گیا۔

صدیق بلوچ نے ایک بڑا ہاتھ مارا، اور حیدرآباد چلا گیا۔ وہاں ایک سیاسی جماعت میں شمولیت کرلی۔ پارٹی کو ایسے صاحب بصیرت راہنما کی سخت ضرورت تھی۔ سیاست اور بدمعاش کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صدیق بہت خوش ہوا۔ کام اس کی پسند کا تھا، ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ اس نے اپنے والد پر جیت کا نشہ جھاڑا۔ "بابا! تم بولتا تھا، ڈنڈی ماری مت کرو۔ دیکھو تمھارا شرافت کام نہیں آیا۔ ہمارا ڈنڈا ماری کام آیا۔"

صدیق کے والد نے شکست تسلیم کی۔ "پتر! ہم تو پاکستان آئے تھے مگر یہ غنڈستان ہے، تم نے اچھا کیا ڈنڈا مار بن گئے۔"

سبھی دوست زندگی کی دوڑ میں ایسے دوڑے، ایک نہ ختم ہونے والی میراتھون کہ ان کا اپناپن ہی ختم ہوگیا شادیاں ہوئیں، بیویاں کھا کھا کر دنبیاں بن گئیں، بچے پیدا ہوگئے۔ ہر ایک اپنی

اپنی بقا کی جنگ میں کود پڑا۔ روپیہ کمانے لگا۔ دوست دور دراز کے شہروں میں اتفاقاً ملا کرتے۔ اب وہ کبھی کبھار آپس میں ملتے تو بابو کی باتیں ضرور ہوا کرتیں۔ معلوم ہوا کہ نسیم ہائی اسکول کی ہیڈ مسٹریس بن چکی ہے۔ بڑا کروفر ہے، جب کہ بابو بدستور کلرک لگا ہوا ہے۔ شادی سے مزید گھس گھسا گیا ہے۔ میاں بیوی کے رتبے اور آمدنی میں بھی زمین و آسماں کا فرق ہے۔ دونوں چاہنے والوں کے درمیان کلاس وار شروع ہو چکی ہے۔

ایک روز نسیم نے بابو کو ڈانٹ دیا۔ وہ محکمہ تعلیم کی کسی تقریب میں ساتھ جانا چاہتا تھا۔
"میں ساتھ نہیں لے جاؤں گی، بڑی شرم آتی ہے۔ باقی ہیڈ مسٹریس تو تعارف کراتی ہیں، ان کا شوہر اتنا بڑا افسر ہے، یہ ہے وہ ہے۔ میں کیا بتاؤں، میرا شوہر کلرک ہے؟ تمہارا وہ نالائق دوست بدکردار، بدمعاش انور ساری عمر نقلیں کرتا رہا، لو فر وہ سی ایس ایس کر گیا۔ تم کلرک کے کلرک ہی رہے۔"

بابو کا ٹوٹا دل مزید ٹوٹ گیا۔ "اتنا غٹ غٹ مت مارو، ہم پہلے ہی ٹکڑ ٹکڑ ہے۔ تمہارا خاطر ہم تباہ ہو گیا ظالم۔"

بابو نے مردانہ وار ستم برداشت کیے تھے، چرکے سہے تھے مگر نسیم کے طعنوں سے بکھر کر رہ گیا۔ اس سراپا ناز نے بابو کو ناتواں جان کر دھول دھپا بھی بہ طور شیوہ اختیار کر لیا۔

بابو کا دل بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ کسی گوند سے بھی جڑنے کے قابل نہ رہا تھا۔ بابو نے بن باس لے لیا۔ خفا ہو کر اس حجاج بن یوسف چچا کے پاس چلا گیا، جس نے خالو کے مکان پر مفت قبضہ کر رکھا تھا۔ پرانے دوست بکھر چکے تھے جو اسے منا کر واپس لے آتے۔ گھوڑا ابھی اپنے بچوں کی روزی کا تانگہ کھینچ رہا تھا۔ آمدنی بڑھانے کے لیے اس نے ایک اخبار میں شام کی ملازمت کر لی تھی۔ کسی کو بھی علم نہ ہو پایا کہ بابو کوئٹہ کو داغِ مفارقت دے گیا ہے۔

صدیق کو اِن رہنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے ایک ادبی جلسہ کیا؛ ایک بڑا مشاعرہ۔ شاعر، مشاعروں کی بو سونگھتے پھرتے ہیں، کچھ نقد زر بھی مل جاتا ہے، کچھ واہ واہ بھی ہو جاتی ہے، مفت کی شراب بھی ملتی ہے۔ مشاعروں کے نام پر دوڑے چلے آتے ہیں۔

صدیق نے انور کو مہمانِ خصوصی بنایا لیکن قسمیں دیں کہ تقریر اُردو میں کسی اہلِ زبان سے لکھوا

لائے، تلفظ بھی درست کرالائے۔ ورنہ خاموش بیٹھا رہے۔ صدارتی تقریر بھی نہ کرے۔ کہہ دیں گے کہ مہمان خصوصی گونگا ہے۔ کوئٹہ کی اردو بولی تو شاعر رسہ تڑوا کر بھاگ نکلیں گے۔ ایم کیو ایم والوں سے مار بھی پڑے گی۔

انور کی تعیناتی کراچی میں تھی مگر زیریں سندھ کا علاقہ اسی کے دائرہ اختیار میں تھا۔ وہ ایک سرکاری دورہ بنا کر حیدرآباد چلا گیا۔ تقریب اتوار کو تھی، انور ہفتہ کے روز ہی چلا آیا، تاکہ صدیق سے گپ شپ رہے، اکٹھے بیٹھ کے پی جائے۔ صدیق نے اسے اپنا دفتر دکھایا جس پر پارٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جلی حروف میں لکھا تھا بورڈ پر: "صدیق بلوچ، جنرل سیکرٹری فلاں پارٹی۔" اب وہ ڈاکے نہیں ڈالتا تھا۔ حکومت سے لاکھوں کا قرضہ لیتا اور سیاسی اثر و رسوخ سے معاف کروا لیتا۔ اس طریقہ واردات میں پکڑے جانے کا احتمال بھی نہ تھا۔ انور بہت متاثر ہوا، اس نے اس کا اظہار بھی کیا صدیق سے کہ کاش وہ تعلیم حاصل نہ کرتا، سیاست کرتا اور ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا۔

صدیق نے پُرتکلف لنچ دیا تھا۔ انور بہ اصرار اسے ریسٹ ہاؤس ساتھ ہی لیتا آیا کیوں کہ شاعروں کے ساتھ زیادہ بیٹھنے سے دل کو ہول آتا تھا۔ زمانہ طالب علمی کی باتیں ہوتی رہیں۔ سہ پہر میں ماضی کی یاد تازہ کرنے کے لیے حیدرآباد کے پل کے ساتھ اسی ہوٹل میں چائے پینے کی ٹھانی۔

صدیق نے واپس وپیش سے کام لیا: "ہم تو خیر عوامی آدمی ہے۔ تم اتنا بڑا افسر ہے۔ تمہارا اتنا کنڈکٹ ہے، پروٹوکول ہے، اچھا نہیں لگے گا وہ خستہ ہوٹل ہے۔"

انور نہ مانا: "زہے خیر ہے۔ خستہ کلوں کے ساتھ چائے پئیں گے۔ ٹرک والوں کے ساتھ بیٹھیں گے۔"

دونوں ہوٹل پہنچے تو مالک بہت متاثر ہوا۔ دوڑا چلا آیا۔ دو لرزتی ہوئی کرسیاں پیش کیں۔ ایک رعشہ زدہ میز درمیان میں رکھ دی۔

صدیق نے آرڈر دیا اور باہر والا کو بولا: "دو چائے دودھ پتی۔"

"بلوچ صاحب! آپ تشریف لائے، زہے نصیب۔ چائے میری جانب سے ہوگی۔" ہوٹل والا بچھا جاتا تھا۔ انور کو سرکاری افسر سمجھ کر اس کی بھی آؤ بھگت کر رہا تھا۔

دونوں چائے پیتے ہوئے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ اس پُل کو بھی دیکھ رہے تھے جس سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ جس سے لٹک کو بابو کئی روز خودکشی کی کوششیں کرتا رہا تھا۔

اچانک دونوں ششدر رہ گئے۔

اس پُل سے کوئی شخص خودکشی کے ارادے سے لٹکا ہوا تھا۔

''زوئے ہمارا خیال تھا دنیا بدلا ہے بلوچ بھائی۔ کدھر بدلا ہے، یار لوگ ماذ محبت کا خاطر ابھی تک خودکشی کرتے ہیں۔ چلو کہ چلیں اس خانہ آباد کو روکیں۔''

چائے چھوڑ دوہ پل کے نیچے آ کھڑے ہوئے۔

صدیق نے گھرکی دی۔ ''زوئے کیا کرتا ہے، مرے گا۔''

خودکشی کے ارادے سے لٹکتے شخص نے بلندی سے نعرہ لگایا۔ ''اڑے تم صدیق، اڑے انور۔۔۔''

خودکشی کے کم زور ارادے سے بلندی پہ پُل کے اوپر لٹکنے والا اجنبی کوئی غیر نہیں تھا اپنا بابو ہی تھا۔

اُردو کا دبستانِ کوئٹہ

کوٹہ (قلعہ) کا لفظ بگڑ کر کوئٹہ کہلایا۔ جس کی آبادی انیسویں صدی کے وسط تک پانچ ہزار تھی۔ انگریزوں نے افغان جنگوں کے باعث کوئٹہ کو چھاؤنی بنایا۔ جس کے باعث پورے ہندوستان سے افسر، ٹھیکیدار، مزدور، کاریگر، مستری، مکینک بلالیے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوئٹہ ایک بڑا شہر بن گیا۔ جس میں ہندوستان بھر کی زبانیں بولنے والے تلاشِ معاش میں چلے آئے۔ تجارتی، سفارتی، مذہبی روابط بھی بڑھے۔ ڈیورنڈ لائن نے کوئٹہ کی اردو کو ایک نیا رنگ دیا۔ برطانوی افواج کے افسران، سول ملازمین ہندوستانی رجمنٹوں کے سپاہی، ریلوے ڈاک وتار کے ملازمین، سوداگر، کھیل تماشے والے، رمال، منڈوان والے، نجومی، پیر فقیر بھی آتے جاتے رہے۔

1883 میں کوئٹہ چھاؤنی قائم ہوئی تو کوئٹہ کے نقوش ہی بدل گئے۔ ہندو، سکھ، مسیحی، پارسی، بوہرہ، تاجر اردو کو نئے رنگ میں ڈھالنے لگے۔ دیگر زبانوں کے بے شمار الفاظ اردو نے سمو لیے۔ اردو ہر دھرتی کی مٹی بدن پہ مل کر مہکنے لگتی ہے۔ مشاعرہ اردو ادب کا Cultural Invasion ہے اور یہاں حکومتی ہتھیار کے طور پر ہی استعمال ہوتا رہا جس نے اردو کو مزید مقبولیت بخشی۔

بلوچستان اسمبلی نے 1972 میں سوفیصد اکثریت سے اردو کو ہی سرکاری زبان قرار دیا۔ اس دبستان کا اپنا مزاج، رنگ ڈھنگ ہے، اپنا ہی روزمرہ اور محاورہ ہے۔ کوئٹہ میں رہنا ہو تو اس کی اردو اپنائیے، ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ محض تین واقعات ہی بطورِ عبرت لکھ رہا ہوں۔

پرائمری اسکول زیارت میں یوم آزادی کی تقریب تھی۔ ہم جھنڈیاں لہرا کر قومی نغمے پڑھ رہے تھے۔ ان دنوں فلم "بیداری" کا گیت "اس ملک کو رکھنا میرے بچو سنبھال کے" مقبول تھا۔ کچھ طلبا نے اسٹیج پہ گیت گایا۔ وہ جماعت تقریب کے بعد باہر نکلی تو اس پہ حملہ ہو گیا۔ پشتون بچوں نے تھپڑوں، لاتوں، گھونسوں پہ رکھ لیا۔ اساتذہ دوڑے چلے آئے۔ لیویز کے اہلکار کیا تھا نیدار بھی چلا آیا۔ اس کے بول "ٹھوکر میں زلزلے یہاں، ہیں مٹھی میں طوفان یہاں، سر سے کفن باندھے پھرتا ہے، دیکھو ہر ایک پٹھان یہاں" پہ مشتعل ہو گئے کہ ہماری پگڑی کا کوئی مذاق اڑاتے ہو، موت کے نشان کو کفن کہتے ہو، ہم مردہ ہیں کیا! معافی تلافی تو ہوئی مگر میرے کئی ایک دوست زخمی ہو چکے تھے۔

سردار الیکشن ہارا، منہ چھپانے کے لیے بیماری کا بہانہ کر کے لیٹ گیا۔ ایک لکھنوی پڑوسی مزاج پرسی کے لیے آیا اور کہا، "سردار صاحب! سنا ہے کہ دشمنوں کے مزاج ناساز ہیں۔ میں خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔" سردار آپے سے باہر ہو گیا۔ بولا کہ دشمنوں نے دھاندلی سے الیکشن جیتا، ان کی خیریت پوچھنے میرے پاس آئے ہو؟ میں بتاؤں دشمنوں کی خیریت؟ محافظوں کو حکم دیا کہ اسے درخت سے باندھ کر منہ کالا کر دو۔ چند گھنٹوں بعد ترس آیا تو کہا کہ اسی حالت میں پیدل اس کے گھر لے جاؤ۔

نواب خیر بخش مری کے صاحبزادے بالاچ مری مزاحمتی جنگ کے دوران افغانستان اور بلوچستان کی سرحد سرلٹھ کے مقام پر کسی مڈبھیڑ میں شہید ہو گئے تو ان کے ساتھیوں نے وہیں کہیں انھیں دفنا دیا۔ بلوچستان میں آگ لگ گئی، کہرام بپا ہو گیا۔ میرے دوست ڈاکٹر چشتی مجاہد روزنامہ 'جنگ' اور 'اخبارِ جہاں' کے کالم نگار بھی تھے۔ انھیں کہا گیا کہ نوابزادہ بالاچ مری پر جامع مضمون لکھ کر بھجوائیں۔ ان کا مضمون کراچی ہیڈ آفس پہنچا تو کسی دہلوی لکھنوی نے عنوان بدل کے "دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں" لکھ دیا۔ پھر کیا تھا، اضطراب پھیل گیا کہ توہین آمیز الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ چشتی چیختا چلایا کہ عنوان کراچی نے بدلا ہے، مگر چند ہی روز بعد سیٹلائٹ ٹاؤن کی مسجد میں چشتی کی نمازِ جنازہ میں شامل میں سوچ رہا تھا کہ کاش کوئٹہ کی اردو کو ملکی سطح پہ سمجھا جا سکتا!

اس ناول میں استعمال ہونے والے ثقہ اردو کے مخصوص الفاظ، اصطلاحات، روزمرہ، محاوروں اور تلمیحات کی فرہنگ ذیل میں دی جا رہی ہے۔

فرہنگ

آبادی ہونا	خوب سرسبز ہونا، فصل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اس مرتبہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے ہماری آبادی نہیں ہوئی
آسرا تاوان ہے	اگر فوری اقدام کے متقاضی کام میں لیت و لعل یا تاخیر کی گئی تو نقصان کا خدشہ ہے
آسرا مار	کچھ ہتھیانے کے لیے رابطہ رکھنا
آموختہ	ہلا ہوا، عادی
اَڑی کڑی کرنا	ٹال مٹول سے کام لینا، کٹ حجتی کرنا، کسی کام کو انجام نہ دینے کے لیے حیلہ بہانہ کرنا
بارہ پتھر بار	سمجھ سے بالاتر
باڑی	خانے بنا کر لڑ کے کھیل کھیلتے ہیں
باید	ضرور، لازماً
بھنڈار کرنا	گپ شپ لگانا، مجلس کا گرم ہونا یا مجلس گرم کرنے کرنا
بکری گم کرنا	پریشان، بدحواس کر دینا
بڑے کا گوشت کھانا	دوستی میں ہندو گائے کا گوشت بھی کھا جاتا ہے
بچہ خوش	افلاطونی محبت کرنے والا
بچھو کا زہر	بے انتہا نشہ کرنے والوں پر جب عام نشہ آور اشیا بے اثر ہو جاتی ہیں تو دہکتے ہوئے کوئلوں پر بچھو رکھ کر اس دھوئیں کو اسٹرا سے سگریٹ کی طرح پیتے ہیں
بلا مانگنا	غرض رکھنا
بولڈ ال	بڑے دل والا، بے خوف و بے پرواہ شخص

بیخ نکل جانا	نقصان پہنچانا
بے غم ہو جانا	بے فکر ہو جانا
بے غیرت	سب اسٹینڈرڈ، غیر معیاری
پاٹ باز	ڈراما باز
پائیں کرنا	حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرنا، اداکاری کرنا
پٹوڈ ڈالنا	جھانسہ دینا
پٹکا مارانا	بڑا بول بولنا، ڈینگیں مارنا
پشیمانی	جرمانہ، قصور ثابت ہونے پر کسی کا جرمانہ ادا کرنا
پھیٹ دینا	لعنت ملامت، ہاتھ کے پنجے (پانچوں انگلیوں) سے لعنت کا اشارہ بنانا
تھانہ روڈ	کوئٹہ کا بازارِ حسن
تیر کرنا	گزارنا، واجبی قیمت پہ فروخت کرنا
ٹائیٹ پائٹ	چاق و چوبند، ہر طرح سے تیار
ٹپال لگانا	اسمگلنگ کا پھیرا لگانا
ٹسن کرنا	نخرے کرنا
ٹکری	قبائلی نظام میں ایک سربراہ
ٹوپ ٹوپ کرنا	غیر ضروری جوش و خروش کا مظاہرہ کرنا
ٹیڑھا ٹیڑھا دیکھنا	غیر دوستانہ انداز میں دیکھنا
ٹکر ٹکر	تباہ حال، مفلس، شکستہ دل
ٹیڑھا میڑھا چلنا	غرور، غصے میں، یا ناز و انداز سے چلنا، اترانا
ٹیلو	لڑکوں کا کھیل جس میں ایک دوسرے کو پکڑنے کے لیے میلوں بھاگتے ہیں

جان کو پکڑنا	اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھنا
جُٹ	ساتھی، ہم پیالہ، ہم نوالہ
جنجال	پریشان
چپر کرنا	چھپا دینا، غائب کر دینا
چپیٹ	تھپڑ، طمانچہ
چرخ	لگڑ بگڑ، Hyena جسے گھیر گھار کر غاروں سے پکڑ کر کتوں سے لڑایا جاتا۔ برسوں یہ کوئٹہ کی اکلوتی تفریح رہی۔
چُرتی	گہری سوچ میں ڈوبا، اپنے آپ میں مگن
چرت خراب کرنا	پریشان کرنا، مشغولیت میں خلل ڈالنا، رنگ میں بھنگ ڈالنا
چمنی	باغیچہ
چلتن بابا	کوئٹہ کا ایک لوک کردار۔ انگریز نے ان کے مزار کے نام سے چلتن روڈ، چلتن میس منسوب کیا۔ 1984 میں قبر کشائی کے بعد خفیہ طور پر جسد خاکی کچھ روڈ میں دفن کیا گیا، کیوں کہ چلتن بابا کینٹ انٹری پاس سے محروم تھے۔
چلہ کوٹھی	کسی گھر میں جسم فروشی کا اڈہ
چھوٹا ہونا	بچپن سے ایک ساتھ کھیل کود کر بڑا ہونا، ایک ساتھ پرورش
حق و نا حق	خواہ مخواہ۔ بلا وجہ
خٹ کلہ	بڑی پگڑی والا، مجازاً ان پڑھ دیہاتی
خر	کسی بھی صفت میں اضافہ کرنے کے لیے لگاتے ہیں؛ خرختم، خرکنجوس
خراہانی	شاہ خرچ
خرناٹ	زبردست

ختم	ناکارہ
خشترہ	بے وقعت
دست لافی	بوہنی، دکانداری کے آغاز میں پہلے گاہک سے جو آمدن ہو
داش	تنور
داشتی کا گدھا	جو ایک بار ایندھن لانے کے علاوہ ہمہ وقت بے کار کھڑا رہتا ہے، مجاز اًاپڑحرام، لاتعلق انسان
دال میں انڈا دینا	تمھاری گھٹیا دال میں انڈا ڈال کر اس کا رتبہ بڑھا سکتا ہوں
دربدر	پریشان حال، بوکھلایا ہوا
دستی دستی	ہاتھوں ہاتھ، فوراً
ڈباڈب	گتھم گتھا
ڈبل ڈبل	بھاگ دوڑ کرنا، دوڑ دوڑ کر کسی عمل کو دہرانا
روزہ پکڑنا	روزہ رکھنا
زور کو سلام ہے	طاقت ور کی اطاعت لازم ہے
زوڑ کافر	پرانا گناہ گار، جس کی اصلاح ممکن نہ ہو
سر برابر ہونا	طبیعت بحال ہونا، اچھے یا خوش گوار موڈ میں ہونا
سوختائی	اشتعال انگیز، غصہ دلانا
سوختہ ہونا	اشتعال میں ہونا
سیال	کزن
شاٹ ہونا	کھسک جانا، غائب ہو جانا
شرارت	سازش
شکر خور کو شکر، موذی کو ٹکر	اچھے کو انعام، برے کو سزا

شک کرنا	تکلف کرنا، شرمانا
صبح مردان	علی الصبح
طبیعت بند ہونا	موڈ ٹھیک نہ ہونا۔ کسل مندی
ظالم	بہت اچھا، بہت خوبصورت، جیسے فلاں ظالم شاعر ہے، فلاں خاتون ظالم ہے، یعنی بہت دلربا ہے، فلاں مُلا ظالم ہے، یعنی بہت قابل ہے
عاشقو	کوئٹہ کا لیجنڈری خدا ترس بدمعاش، جو سکھر میں پولیس سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا
عاقل خان	سر پھرا، عاقبت اندیش عاشق، شاہ جہان کی بیٹی مہر النسا کا محبوب، جسے مہر النسا نے طعنہ دیا کہ وہ اس کے باپ کے ڈر سے محبت کتنی کترا رہا ہے اور یہ مصرع لکھ کر بھجوایا: "شنیدم ترکِ الفت کرد عاقل خان بہ نادانی" جواباً عاقل خان نے یہ مصرع لکھ کر بھجوایا: "چرا کارکند عاقل کہ باز آید پشیمانی" ایک روز رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے بادشاہ نے چھاپہ مارا، تو شہزادی نے پانی کی دیگ میں چھپا دیا۔ بادشاہ نے دیگ کے نیچے آگ جلوا دی۔ عاقل خان نہ چیخا نہ چلایا، نہ باہر نکلنے کی کوشش کی۔ شہزادی کو بدنامی سے بچانے کے لیے جان دے دی۔
غرق ترک	خیالوں میں ڈوبا ہوا
غوز	چکنا، چکنی جلد کا خوبصورت لڑکا
تاب سناوئیں	بے نقط سنانا

کافر	بہت اعلیٰ۔ جیسے کافر ملاں، یعنی بہت قابل مولوی
کافر کنج	مکمل گوشہ تنہائی، جہاں کوئی متلاشی بھی نہ آپائے
کٹ کٹ دیکھنا	غصے یا خار بازی سے دیکھنا
کلٹی کرنا	الٹا دینا، مفعول بنانا
کوچرائی	شرمندگی
کھنڈ و غلام	ناہموار میدان، ہم جنس پرستوں کا پسندیدہ علاقہ
کوہِ مراد	تربت کا نواحی مقدس پہاڑ، جہاں ذکریوں کا حج ہوتا ہے
قندھاری ہوا	سخت سرد ہوا، گور یچ
گتا خانہ	شراب خانہ نما، جہاں چرس، بھنگ و دیگر نشہ آور اشیا فروخت ہوتی ہیں، پی جاتی ہیں
گھوڑا اباب کا غار	ایک مزار کے پہلو میں زیر زمین اڈہ
گندخ کرنا	نومولود کو کپڑے میں لپیٹ کر باندھنا
گولی مارنا	نظر انداز کرنا، درخورِ توجہ نہ سمجھنا
گیڑو	سفید جھوٹ بولنے والا
لنگڑی	فلاش میں دو تین پانچ کا طاقتور راؤنڈ
لائٹیں مارنا	حسن یا خوشی سے دمکنا
لغڑی	لفظی مطلب برہنہ حال، مجازاً آوارہ گرد، غنڈہ ٹائپ، اٹھائی گیر، چھوٹی موٹی سمگلنگ کرنے والا
لنگ ولاش	بے سروسامان
لوگیں	جمع در جمع یعنی بہت سے افراد
ماذ	یوں ہی
مٹی ایک ساتھ	ایک ساتھ غم کرنا، ہمدردی کرنا، کسی کے لیے اچھا سوچنا

مخامخ بولنا	منہ پر بات کرنا، دلیرانہ اظہارِ خیال
معتبر	معزز، بااثر
ملنگ ہوٹل	کوئٹہ کا ایک ہوٹل جہاں فقیروں کو دال روٹی مفت ملا کرتی۔ مجازاً مفت کا کھانا
مم	Sphinx، بالائی دھڑ عورت کا اور باقی جسم شیرنی کا۔ جو روایتی طور پر مردوں کو اٹھا کے کوہِ مردار میں لے جایا کرتیں، مردوں کے پاؤں کے تلوے چاٹ چاٹ کے پاؤں کمزور کر دیتیں تاکہ مرد بھاگ نہ پائے
ناژوائی	بے ہمتی، بزدلی
وختی	جلدی، بروقت
ہڑادوڑی	ہنگامہ، افراتفری

آغا گل کا فکشن

افسانے

گورپچ

گوانکو

راسکوہ

آکاش ساگر

پرتھوی غوری

پرندہ

مشین گردی

سونے پہ اگی بھوک

بولان کے آنسو

آبِ حیات

پاسینگان کا مطلب کیا

ناول

دشتِ وفا

بیلہ

بابو

فسانہ جنات

تحقیق

حضرت علی کی پیش گوئیاں — نہج البلاغہ کے تناظر میں

پارس لفظیں — حضرت علی کے اقوال کا مجموعہ

شدرومرجان — علمی تحقیق

بلوچستان میں اُردو فکشن — تحقیق وتنقید

بلوچی بائبل کی تاریخ

شاعری

رہِ حافظ وخیام

تراجم

شریمد بھاگوت گیتا کا ترجمہ

غازی نورامینگل (طویل براہوئی لوک نظم کا ترجمہ)

متفرق

انتخابِ گل

آغا گل کے افسانوں کا انتخاب — مرتبہ : کلیم شہزاد

رُوپ سروپ

آغا گل کے افسانوں کے پنجابی تراجم — مترجم: کلیم شہزاد

آغا گل کے فکشن کے تراجم

مہر آتا ڈیھ

افسانوی مجموعہ مہر گڑھ کا براہوئی ترجمہ — مترجم: پروفیسر سون براہوئی

بیلہ

ناول 'بیلہ' کا براہوئی ترجمہ | مترجم: پروفیسر سون براہوئی

خلیجا

منتخب افسانوں کا براہوئی ترجمہ | مترجم: صلاح الدین مینگل

گنوک

منتخب افسانوں کا براہوئی ترجمہ | مترجم: نادر شاہوانڑیں

باھوٹ

منتخب افسانوں کا براہوئی ترجمہ | مترجم: ثناءاللہ تبسم

آسماں سوزیں ساوڑ

منتخب افسانوں کا بلوچی ترجمہ | مترجم: غوث بخش صابر

بلوچی بائبل ءِ تاریخ

'بلوچی بائبل کی تاریخ' کا بلوچی ترجمہ | مترجم: چاکر فضل

وفا جو رِڑپَٹ

ناول 'دشتِ وفا' کا سندھی ترجمہ | مترجم: ننگر چنا

پکھی اٹیں بی کہاڑیوں

منتخب افسانوں کا سندھی ترجمہ | مترجم: ستار پیرزادو

آغا گل کے فن و شخصیت پہ لکھی گئی کتابیں

صحرا کی ہتھیلی پہ دِیا

آسناتھ کنول

آغا گل کے افسانوں میں بلوچستان کی ثقافت

منزہ مبین

آغا گل کے ناولوں میں اُردو کی لسانی تشکیل نو

عطاالرحمان

آغا گل کی ناول نگاری: تہذیبی، فکری اور فنی مباحث

فرزانہ خدرزئی

اب تک : آغا گل کا فکر و فن

طفیل اختر

میرے فکشن کو سمجھنے کے لیے بلوچستان کے گلی کوچوں کی زبان سے شناسائی ازحد ضروری ہے۔ قبل ازیں میرؔ نے کہا تھا کہ دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیاں اس کے کلام کو سمجھنے کے لیے ازبسکہ ضروری ہیں۔ کوئٹہ میں بھی سات قومی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جس پر اہلِ کوئٹہ کو بجاطو پر ناز ہے۔ غیر معروف زبانوں کا توذکر ہی کیا۔ دہلی میں بھی سات قسم کی اردو بولی جاتی تھی، جبکہ کوئٹہ کی اردو سات قومی زبانوں کو اپنے اندر سمو چکی ہے۔ یہ سلسلہ چند سالوں نہیں بلکہ ہمایوں اور اکبر بادشاہ کے دور سے جاری ہے۔ اردو کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر زمین کی خوشبو اپنے بدن میں شامل کر لیتی ہے، ہر لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔ کوئٹہ کا اپنا دبستان اردو ہے۔ جسے تسلیم نہیں کیا جاتا۔

کوئٹہ کی اردو کو پہلی بار میں نے تحریری زبان بنایا۔ میں نے کلیکشن، جارگن اور ریجنل ازم میں لکھا۔ یہ ایک ٹرینڈ سیٹر ناول ہے۔ بلوچستان کی یہ غیر ادبی تحریری زبان ہے۔ جسے میں نے ادبی طور پر متعارف کرایا۔ ایسی کاوشوں سے کسی بھی زبان میں وحدت آتی ہے۔ نئے الفاظ، تراکیب، محاورے کا اضافہ کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے ازحد ضروری ہوا کرتا ہے۔ زبان ہی سماج کا مظہر ہوا کرتی ہے۔

آغا گل